گریہ شب سے سرخ ہیں آنکھیں مجھ بلانوش کو شراب کہاں
(میر)

میرِ بلانوش

بالکل نئے حوالوں سے میر تقی میر کے اشعار کی تفہیم

مشکور حسین یاد

گریۂ شب سے سُرخ ہیں آنکھیں
مجھ بلانوش کو شراب کہاں
(میرؔ)

بالکل نئے حوالوں سے میر تقی میرؔ کے اشعار کی تفہیم

مشکور حسین یادؔ

باراول: مارچ 2001ء

ناشر: آغا امیر حسین
کلاسیک، چوک ریگل (مال) لاہور
فون: 7312977 فیکس 7323963
ای میل: classic_spt@hotmail.com
کمپوزنگ: ذیشان حیدر
طابع: یمانی پرنٹرز لاہور

انتساب

اُن باہمّت لوگوں کے نام
جو میر تقی میر کی طرح
اپنے دُکھوں کو طاقت بنا کر
جینے کا ہُنر جان لیتے ہیں

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دلِ پرخوں کی اِک گلابی سے
(میرؔ)

فہرست

دیباچہ

دل پرخوں

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے میر تقی میر صاحب پر شروع سے آخر تک ایسے ایسے آلام ومصائب کے پہاڑ ٹوٹے کہ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید زندہ نہ رہتا اور اگر زندہ رہتا تو اس کے ہوش وحواس اس طور قائم نہ رہتے۔ اوائل عمر ہی میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا عام زندگی میں بھی یہ کوئی معمولی غم نہیں ہوتا۔ ایک طرف بچے کی لطیف حِسیت دوسری طرف اردگرد کے لوگوں کی بے حسی یا اگر احساس ہوتا بھی ہے تو اس طرح کا نہیں جس سے بچے کی لطافت حس کا مطالبہ پورا ہو سکے۔ لہٰذا چھوٹی عمر میں والدین کی شفقت سے محروم ہونا اور وہ بھی ایک ذہین بچے کا محروم ہونا یقیناً زندگی کا یہ سب سے بڑا غم ہوتا ہے۔ اور پھر اس غم کی عمر بھی بڑی لمبی ہوتی ہے۔

میر صاحب نے اس غم کو کس طرح برداشت کیا اس کو ہم تصور ہی کر سکتے ہیں۔ البتہ والدین کے اس غم پر وقتی طور پر میر صاحب کے حوالے سے جو بجلی پڑی وہ غم عشق کی بجلی تھی۔ یعنی جیسے ہی میر صاحب نے نوجوانی کے عالم میں قدم رکھا انہیں اپنی ہی کسی رشتہ دار دوشیزہ سے عشق ہو گیا۔ عشق اور وہ بھی اٹھتی جوانی کا عشق یہ عشق اس قدر زور دار ہوتا ہے کہ دوسرے تمام غموں کا ایک دفع تو قلع قمع کر ڈالتا ہے۔ جی ہاں والدین کی شفقت سے محرومی کا غم بھی اس غم کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور پھر میر صاحب کی محبوبہ رشتہ دار ہونے کے باعث ایک طرح اسی گھر میں رہتی تھی اس لیے گاہے بگاہے غم عشق کا لطف ومہربانی اور شفقت میں بدل جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ محبوب کا سامنے رہنا خواہ اسے ہاتھ لگایا جائے یا نہ لگایا جائے یا اس سے بات کی

جاسکے یہ تجربہ اپنی جگہ بے قراری سے بھرپور ہونے کے باوجود خوش گواری سے لبریز بھی ہوتا ہے اور یوں یہ تجربہ آدمی کو عجیب قسم کی ڈھارس بھی دیتا ہے اور اسے عاشقی کے لیے تیار اور مجتمع بھی کرتا ہے۔ غالباً میر کے اس مشہور شعر کا یہ خوبصورت تجربہ بھی انہیں دنوں کی یادگار ہے۔

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لے کر چھوڑ دے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

وہی بات کہ ان دنوں میر صاحب اپنی اس عاشقی کے تجربے کے بے تابیوں اور بے چینیوں کے باوجود لطف و سرور کے عالم سے بھی گزر رہے تھے جس کے باعث ساتھ ہی ساتھ میر صاحب میں زندگی گذارنے کی ایک عجیب مست کر دینے والی طاقت اور توانائی بھی پیدا ہو رہی تھی لیکن جیسا کہ میر کی سوانح سے پتا چلتا ہے جلدی ہی میر صاحب کا یہ عاشقانہ راز فاش ہوگیا اور انہیں آگرہ چھوڑ کر دلی آنا پڑا۔ محبوب سے اس جدائی نے میر صاحب کو پاگل پن کے تجربے سے بھی آشنا کیا اور پھر ان کی متخیلہ نے انہیں ان کے محبوب کے چہرے کی زیارت سے ہر شب چاند کے چہرے میں فیض یاب کرنا شروع کر دیا۔ خواہ مخواہ نفسیات بگھارنے کی بات الگ ہے ورنہ میں سمجھتا ہوں میر صاحب کا یہ عاشقانہ پاگل پن عین فطرت کے مطابق تھا۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ میر صاحب کے نابغہ روزگار اور حد سے زیادہ ذہین و فطین ہونے نے اس تجربے میں بلا کی شدت پیدا کر دی تھی اور یوں یہ بات بھی عین فطرت کے مطابق ہی قرار پاتی ہے۔ اس پاگل پن کو ورثے کی ودیعت کہنا درست نہیں۔ یعنی میر صاحب کے والد پر بھی پاگل پن کے دورے پڑتے تھے اس لیے میر صاحب بھی اس سے دوچار ہوئے۔

البتہ اس عاشقانہ پاگل پن اور دوسرے آلام و مصائب سے جو چیز عمر بھر میر صاحب کو صحیح و سالم باہر نکالتی رہی اس کی طرف ناقدین نے بہت کم توجہ کی یا اشارے کیے ہیں۔ وضاحت کے ساتھ تو خیر کسی نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ میرا موضوع وہی نظر انداز کی جانے والی اہم حقیقت ہے جس کو ہم میر صاحب کا دل پرخون کہہ سکتے ہیں اور

جسے خود میر صاحب نے اپنے ایک مشہور شعر میں وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پرخوں کی اک گلابی سے

میرے خیال میں میر کی شاعری کو اچھی طرح سمجھنے میں یہ شعر کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس شعر کی روشنی میں کلام میر کو سمجھا جائے تو ہماری بہت سی غلط فہمیاں آسانی سے دور ہو سکتی ہیں اور ہو جاتی ہیں۔ دل پرخوں کی اک گلابی سے میر صاحب کی مراد خون سے بھرے ہوئے یعنی زندگی کے حوصلوں اور جرأتوں سے، بھرے ہوئے مینائے دل سے ہے۔ آدمی کا دل خون سے یعنی ہمت اور حوصلے سے بھرا رہے تو اسے زندگی کا بڑے سے بڑا غم بھی نہیں پچھاڑ سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ ہر نیا غم دل پرخوں کی شراب کو ہمت اور عزائم کی تازہ بہ تازہ آگ دکھا کر اس کے نشے کو مزید تیز کر دیتا ہے۔ اس میں مزید کیف و سرور بھر کر اس کے اثرات کو بے پناہ وسعتیں عطا کرتا ہے۔ کلام میر کا اگر بغور اور ٹھہر ٹھہر کر مطالعہ کیا جائے تو صاف پتا چلتا ہے کہ میر صاحب کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا رہا ہو جس میں انہوں نے اپنے دل پرخوں کی اس گلابی سے ہمت اور حوصلہ حاصل نہ کیا ہو۔ جی ہاں ہر تازہ غم سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ اب یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ میر صاحب پر زندگی میں غم و آلام کے تابڑ توڑ حملے ہوتے رہے اور وہ ان حملوں کا جواب دیتے ہوئے بظاہر اعتدال کو قائم نہ رکھ سکے۔ بظاہر کا لفظ میں نے یہاں اس لیے استعمال کیا ہے کہ غم و آلام کے جس قدر شدید حملے ہوتے میر صاحب اُسی شدت کے ساتھ ان حملوں کا جواب دینا بھی ضروری سمجھتے۔ میری دانست میں یہاں میر صاحب ایک رند بلانوش کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ حق کا دامن انہوں نے یہاں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بلکہ اپنے ہاتھ کی گرفت کو مزید مضبوط رکھنے میں وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔ انہوں نے اس ضمن میں کبھی غفلت نہیں برتی۔ لیکن عموماً یار لوگوں نے میر صاحب کی اس رندانہ ادا کو بھی نہیں سمجھا۔ جیسے جیسے میر

صاحب اپنے کسی تازہ غم سے ڈٹ کر مقابلہ کرتے لوگ یہی سمجھتے جیسے وہ اس غم سے گھبرا گئے ہیں۔ کسی غم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کرنا یا اس سے دست و گریبان ہو جانے کا یہ مطلب کسی طرح بھی نہیں لیا جاسکتا کہ دست وگریبان ہونے والا اس غم سے مرعوب ہوگیا ہے یا مغلوب ہوگیا ہے۔ البتہ دشمن سے مقابلہ کرنے کی وجہ سے جو ایک شوروغوغا کی فضا پیدا ہوتی ہے میر صاحب کے کلام میں وہ پرشور فضا ضرور پیدا ہوئی ہے اس کا اظہار انہوں نے ایک جگہ نہیں کئی جگہ کیا ہے اور یقیناً فخر سے کیا ہے۔

جہاں سے دیکھئے اک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

لیکن اس قیامت کے سے ہنگامے میں اور بادوباراں کے شور میں جو برق بار بار کوندتی ہے وہ علم وحکمت اور عرفان وشعور کی برق نور آفریں ہے جس کی وجہ سے اس سیلِ گریہ میں بھی ہمیں حیات افروز مطالب و مفاہیم کے ان گنت سفینے تیرتے نظر آتے ہیں۔ اور ان سفینوں کو کھینے والا ایک رند بلانوش دکھائی دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے میر صاحب کی کلیات میں یا تو موسلا دھار گریہ وزاری سے متعلق اشعار کی کثرت ہے یا پھر علم وحکمت سے بھرپور اشعار کی ایک وسیع و بلند فضاؤں کی رنگارنگی۔ اور حزن ویاس والے اشعار کی تعداد تو بس اتنی ہی ہے کہ ہم یہ نہ کہہ سکیں کہ میر صاحب پر اس قدر آلام کی یورش رہی لیکن وہ پھر بھی مایوس اور افسردہ نہ ہوئے۔ کیا وہ گوشت پوست کے انسان نہیں تھے؟ مطلب یہ ہے کہ حزن ویاس سے متعلق اشعار کوآپ بلاخوف تردید اعتدال قائم رکھنے والے اشعار کا نام دے سکتے ہیں............ آٹے میں نمک والا مضمون۔

آخر میں ایک بات واضح کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم جس طرح غالب اور اقبال کے اشعار کو نسبتاً زیادہ آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ میر صاحب کے اشعار کو اس طرح آسانی کے ساتھ نہیں پڑھا جاسکتا۔ غالب اور اقبال کے اشعار کو

پڑھنا آسان اس لیے ہے کہ ہمیں اپنے ان دو عظیم شاعروں کے بارے میں پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اشعار کس قسم کے ہیں۔ یا ان دونوں عظیم شعراء نے کس طرح کی زبان استعمال کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غالب اور اقبال کے اشعار کو پڑھنے کے لیے ہمارا ذہن پہلے سے تیار ہوتا ہے۔ جبکہ میر صاحب کے اشعار کے بارے میں ہم پہلے سے اس طرح کی کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ غالب اور اقبال کے ہاں اگر معانی کی بہت سی تہیں ہیں تو ان دو عظیم شعرا کے ہاں خصوصیت کے ساتھ غالب کے ہاں کثرت سے معانی الفاظ کے نیچے چھپے ہوتے ہیں تو میر صاحب کے ہاں الفاظ و معانی اوپر سطح ہی پر ایک دوسرے سے گھتے ہوئے یا بغلگیر ہوئے ہوتے ہیں۔ سطح پر بغلگیر لفظ و معنی کے اس منظر کو ہمارے قارئین کی نظریں جلدی سے اس لیے نہیں دیکھ پاتیں کہ ہماری شعری زبان کی یہ روایت نہیں ہے۔ ہم یا تو لفظ و معنی کو ایک ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے دیکھنے کے عادی ہیں جو عام طور پر ہمارے شعرا یہی کرتے رہے ہیں یا پھر غالبؔ کی روایت ہمارے پاس ہے کہ ہم معانی کو الفاظ کے نیچے چھپا کر انہیں تہہ داری کی صفات عطا کرتے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ میر صاحب کے ہاں تہہ دار اشعار کی نسبتاً کمی پائی جاتی ہے۔ میر صاحب کے اشعار کی ساری گہرائی اور گیرائی آپ کو سطح ہی پر مل جاتی ہے بشرطیکہ آپ آنکھیں کھول کر ان کے اشعار کو پڑھ رہے ہوں۔

غالب کے اشعار کو پڑھتے وقت آپ صرف ٹھٹکتے ہی نہیں آپ کو ان پر ٹھہر نا بھی پڑتا ہے جبکہ میر صاحب کے اشعار پر محض ٹھٹکنا ضروری ہے۔ اگر آپ واقعی اپنے پورے شعور کے ساتھ میر صاحب کے اشعار پر ٹھٹکے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے اشعار کے معانی فوراً آپ کے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ نہ ہوگئے ہوں لیکن شاید یہ سن کر آپ حیران رہ جائیں کہ میر صاحب کے ہر شعر پر ٹھٹکنے کی یعنی توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے میر صاحب کے اشعار کا انتخاب ضروری تھا یا ہے تو ایسی ہرگز کوئی بات نہیں۔ میر صاحب کے اکثر شعر اپنی جگہ مکمل ہیں اور موثر بھی۔ میں اس ضمن میں ناصر کاظمی کا ہمنوا ہوں کہ میر صاحب کے اشعار کے انتخاب کا کوئی سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا۔ میر صاحب کے اشعار میں رطب و یابس تو ضرور ہے لیکن یہ رطب و یابس اس لیے ہے کہ زندگی میں رطب و یابس اپنا ایک مقام رکھتا ہے اور جب مقام رکھتا ہے تو ہر رطب و یابس کا بامعنی ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لیے یہاں پورے وثوق کے ساتھ بے خوف ہو کر کہا جاسکتا ہے کہ میر صاحب کے زیادہ اشعار بھرتی کے نہیں۔ ہر شعر اپنے خاص معنی کی تھوڑی یا بہت بہار دکھا رہا ہے۔

میر صاحب نے اپنے اشعار میں ہر رطب و یابس کو کیوں جگہ دی؟ اگر چہ میں پہلے ہی یعنی ابھی ابھی اس کا جواب دے چکا ہوں لیکن مزید وضاحت کے طور پر عرض کیے دیتا ہوں کہ جس قدر میر صاحب نے زندگی کو کنگھالا پرکھا اور جس قدر وہ مسلسل زندگی کے آلام و مصائب سے دوچار ہوتے رہے اردو شاعری میں کوئی شاعر ہمیں ایسا نظر نہیں آتا۔ آگرے میں سوتیلے بھائی کا سلوک بعد ازاں میر صاحب دلی بھیج دیئے گئے تو یہاں بھی ان کے اس سوتیلے بھائی نے اپنے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کو میر صاحب کے طرف سے بدظن کر کے انہیں ذہنی تکلیف پہنچائی۔ اس کے علاوہ ملک کے سیاسی حالات بھی ابتر تھے۔ میر صاحب نے جنگ میں بھی حصہ لیا۔ غرض کونسا میدان عمل تھا جہاں میر صاحب کو نہیں جانا پڑا۔ یا وہ نہیں گئے۔ پھر وہ ہر طرح کے معانی کا اظہار نہ کرتے تو اور کون کرتا۔

لیکن وہی بات ان تمام آلام و مصائب سے میر صاحب کو جو چیز آبرومندانہ طریقے سے باہر نکال کر لاتی رہی وہ ان کا حوصلہ ہمت یعنی دل پرخوں کی گلابی ہی تو تھی جس کی وجہ سے میر صاحب اپنے تمام دکھوں کے باوجود ہمیشہ ایک خاص کیف و سرور کے عالم میں رہے۔ میں آئندہ صفحات میں یہی دکھانے کی کوشش کروں گا کہ میر صاحب کے دل پرخوں کی اک گلابی نے انہیں کیسے کیسے معانی سے لبریز عالم ہائے نشاط انگیز سے دوچار رکھا۔ جبکہ ان کے کلام میں محض گریہ و زاری ہی کی ایک ہنگامہ خیز فضا نہیں دوسرے سنگین حقائق کی بھی ایک ہنگامہ آرائی اپنے پورے جوبن کے ساتھ موجود ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ میر صاحب کے نشتروں کی تعداد کتنی ہے تو اس ضمن میں بھی میرا

جواب سُن لیجئے کہ میر صاحب کے کلام میں نشتریت تو بالکل بھی نہیں ہے ہاں آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ میر صاحب اپنے قاری کو طاقت سے بھرپور رانجکشن ضرور لگاتے ہیں یا لگانا چاہتے ہیں ان کو آپ نشتر کسی طرح بھی نہیں کہہ سکتے۔ ہاں جس طرح انجکشن لگانے میں معمولی چٹکی بھرنے کی سی تکلیف یا چبھن ہوتی ہے بس اس طرح کا احساس میر صاحب کے طاقت سے بھرپور انجکشن لگانے میں بھی ہوتا ہے۔ اب آپ اس انجکشن لگانے ہی کو نشتر کہہ رہے ہیں تو یہ دوسری بات ہے۔

اردو کلاسز میں اردو پڑھاتے وقت ہمیں اساتذہ نے یہی بتایا تھا کہ شعر غالب میں جذبہ وفکر کا بہت حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ چلیئے صاحب ہم نے اس بات کو تسلیم بھی کر لیا تھا۔ اور سچ پوچھئے تو آج تک اسی تنقیدی جملے کو گرہ سے باندھے رکھا۔ لیکن اب جو میر صاحب پر کچھ لکھنے کے لیے ان کے کلام کا مطالعہ کیا تو پتا چلا کہ جس طرح میر صاحب کے اشعار میں جذبہٴ وفکر ایک جان دو قالب سے بھی آگے ہیں اور گھتے ہیں اور ایک ہو گئے ہیں اس طرح غالب کے ہاں بالکل نہیں۔ غالب کے ہاں ہم جذبہ وفکر کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ میر صاحب کے ہاں اس طرح نہیں دیکھا جا سکتا۔ چنانچہ میں نے جو میر صاحب کے چند اشعار انتخاب کر کے ان کا تجزیہ کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ میں اس طرح کی حرکت میر صاحب کے اشعار کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ غالب کے اشعار پر اپنے انداز کی تفہیم کرنا میرے لیے آسان تھا لیکن وہی بات کہ میر صاحب کے اشعار کی تفہیم کرتے وقت میں اکثر چین بول بول اٹھا ہوں۔

سب سے آخر میں میرے لئے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں نے اپنی اس کتاب کا نام ''میر بلانوش'' کیوں رکھا ہے۔ اس وضاحت کے لیے بھی میں میر صاحب ہی کا ایک شعر ذیل میں درج کر رہا ہوں۔

گریۂ شب سے سرخ ہیں آنکھیں
مجھ بلا نوش کو شراب کہاں

میر صاحب کا کہنا یہ ہے کہ شراب پینا میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا میں

توزندگی کے آلام کی بلاؤں کونوش کرنے کا عادی ہوں اور آپ جانتے ہیں زندگی کے
درد و آلام کو پینے کے لیے جس حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے میر صاحب وہ
اپنے دل پرخوں کی اک گلابی سے حاصل کیا کرتے تھے۔ میں نے اس کتاب میں یہی
بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ میر صاحب کے حوالے سے جب آدمی درد و آلام حیات
کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے تو پھر اس میں کس طرح کی توانائی آجاتی ہے اور پھر وہ اس
توانائی سے کس طرح نہ صرف زندگی دشمن عناصر کا قلع قمع کرتا ہے یا انہیں زیر کرتا ہے
بلکہ اس میں ایک عجیب قسم کی پروقار علم وعرفان سے لبریز شخصیت بھی نمو پاتی ہے۔''مجھ
بلانوش کو شراب کہاں'' سے میر صاحب کا یہ مطلب ہرگز ہیں کہ انہیں عام قسم کی شراب
میسر آنا مشکل تھی یا ناممکن تھی بلکہ اس مصرع سے ان کی مراد یہ ہے کہ جو آدمی زندگی کے
دکھ درد کا مقابلہ ہمت وحوصلہ کے ساتھ کرتا ہے پھر اسے کسی دوسرے عام قسم کے مادی
نشے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے صبر وضبط کی صلاحیت ہی اس کے لیے ایک طرح کا
نشہ بن جاتی ہے۔

میں نے اس کتاب میں اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے میر صاحب کے
مختلف انداز کے اشعار پیش کیے ہیں۔ مثلاً اگر میر صاحب بلانوش نہ ہوتے تو اس طرح
کا شعر نہیں کہہ سکتے تھے۔

میر آؤ گے آپ میں بھی کبھی
سخت مشتاق ہیں تمہارے ہم

اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ ان کا صبر وضبط ہی اِن سے اس اسلوب کا شعر
کہلوا سکتا تھا۔

خوش ہیں دیوانگی میر سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

گویا میر صاحب شراب پینے کے بجائے زندگی کے درد و آلام پیا کرتے تھے
اور اس پینے پلانے کو انہوں نے ''بلانوشی'' کا نام دیا ہے جو بلاشبہ شراب نوشی یا مے نوشی

سے کہیں زیادہ بلند ہمتی اور اعلیٰ حوصلگی کا تقاضا کرتی ہے۔

میں نے اپنی اس کتاب کا آغاز اپنے ایک برخواردار کے گھر واقع ٹورنٹو کینیڈا سے کیا تھا اور اس کی تکمیل اپنے بڑے برخوردار سید صفدر رضا سلمہ کے گھر ریاض سعودی عرب میں کی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ غالب بوطیقا کی تکمیل بھی عزیزم صفدر رضا سلمہ کے گھر واقع شفیلڈ انگلستان میں ہوئی تھی۔ خدا میری اولاد کو ہمیشہ شادو آباد رکھے آمین یہ لوگ ہمارا یعنی میرا اور میری بیوی سعیدہ خاتون کا بہت خیال رکھتے ہیں اللہ انہیں زندگی کی تمام عمدہ خوشیاں اور خوبیاں عطا فرمائے ثم آمین۔

میر صاحب کا لہجہ

شاعری میں ہمارے میر صاحب کے لہجے کو سمجھنے میں ایک دو کو چھوڑ کر باقی ہمارے اردو نقادوں نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں اُس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ میر صاحب کا لہجہ ہر اعتبار سے ہمہ گیر ہے ذرا بتایئے تو سہی لہجے کا کونسا لسانی پہلو ایسا ہے جس کو میر صاحب نے اپنی شاعرانہ زبان میں نظر انداز کیا ہو۔ یا جس کو میر صاحب اپنے تصرف میں نہ لائے ہوں۔ اس طرح دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے کہ جس فراست آمیز فراخدلی سے میر صاحب نے اردو زبان کو مالا مال کیا ہے اُس میں وہ تا حال فرد واحد ہیں۔ اور لاریب کہ اس ضمن میں ان کا ابھی تک کوئی مقابلہ کرنے والا نہیں...... واضح رہے کہ بہت زیادہ یعنی الفاظ کو کثرت سے استعمال کرنا جیسا کہ ہمارے نظیر اکبر آبادی نے کیا اور بات ہے اور الفاظ کو لہجے کی گونا گونی کے پیش نظر استعمال کرنا دوسری بات ہے یوں ہم نظیر اکبر آبادی کو بھی قادر الکلام کہہ سکتے ہیں لیکن میر صاحب کی قادر الکلامی دوسرے ہی معنی رکھتی ہے۔ گویا لہجہ ہے حسب موقع و محل بات کرنا جس کی بے شمار خرد آزما صورتیں ہو سکتی ہیں جن میں سے چند اک مثال کے ساتھ وضاحت کے طور پر ذیل میں پیش کر رہا ہوں یعنی میر صاحب کے اشعار کے حوالوں کے ساتھ......۔

آپ جانتے ہیں عام بول چال بھی لہجے کی ایک صورت ہے اور اپنی جگہ خاصی قابلِ توجہ۔ پھر اس عام بول چال کے رنگ ڈھنگ بھی ایک دو نہیں بہت سارے ہوتے ہیں مزید یہ کہ ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں جو ایک تمازت اور تندی اور تیزی پائی جاتی ہے اس کا احاطہ کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ معنی کو گرفت میں لیجئے تو پوری ذات

الاؤ بن سکتی ہے۔ جذبات پر ہاتھ ڈالتے ہیں تو ہفت آسمان مٹھی میں آتے دکھائی دیتے ہیں الفاظ کی کہکشائیں الگ، ان کی آوازوں کے اتار چڑھاؤ کا عالم الگ غرض لہجے میں عام بول چال کی کیفیت ہی کبھی کبھی تو آدمی کو پوری زندگی سے دست و گریبان کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میر صاحب کا ایک بہت ہی مشہور شعر ہے ذرا اس حوالے سے اس کو ملاحظہ فرمائیے۔

یوں بلاتے ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے
اِدھر آبے ابے اوچاک گریباں والے

ایک تو یہ مطلع ہے اور پھر کس ٹھاٹ باٹ سے طلوع ہو رہا ہے آپ اس کو بخوبی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس میں لہجہ صد فی صد عام بول چال کا ہے۔ لیکن دیکھ لیجئے کس قدر مضبوط اور طاقت ور لہجہ ہے کہ کوئی نہ اس کی مضبوطی سے انکار کر سکتا ہے اور نہ اس کی طاقت وقوت سے پھر اس مطلع یعنی اس شعر سے جو بے تکلفی کی ایک فضا قائم ہو رہی ہے اس کا حسن و جمال اپنے طور پر الگ آپ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا رہا ہے۔ شعر زیر بحث کے مطابق کوچۂ جاناں یعنی اپنے محبوب کی گلی میں میر صاحب اتنی بار اور ایسے بے تکلف انداز میں آئے گئے ہیں کہ اب گلی والے انہیں بہت اچھی طرح پہنچان گئے ہیں لیکن چاک گریبان ہونے کے باوجود میر صاحب کا رویہ محبوب کی گلی کے لوگوں سے کسی پاگل یا دیوانے کا سا نہیں ہے ورنہ لوگ انہیں اس طرح بلاتے کیسے؟ بلکہ چاک گریبانی میر صاحب کی پہچان بن گئی ہے اور پہچان بھی بہت عجز وانکسار کی کہ لوگ ڈرنے کے بجائے انہیں اپنا خدمت گذار سمجھنے لگے ہیں اور اسی خیال کے تحت وہ میر صاحب کو بے ابے او کہہ کر بظاہر بہت حقارت سے پکارتے ہیں۔ لیکن اس حقارت میں بغور دیکھا جائے تو اپنایت اور اعتماد کی ایک عجیب شان بھی نظر آتی ہے۔ ضرور اس طرح پکار کر محبوب کی گلی کے لوگ میر صاحب کے کوئی کام سپرد کرنا چاہتے ہیں ابے او چاک گریبان والے اِدھر اُدھر کہاں پھر رہا ہے ذرا ہمارا یہ سامان اٹھا کر فلاں دروازے تک تو پہنچا دے۔ چاک گریبانی یعنی دیوانگی کو خدمت خلق میں ڈھال دینا کوئی معمولی

کام ہے کیا اور پھر وہ بھی اپنے محبوب کی گلی میں...... یہاں تک پہنچنے میں میر صاحب کو کیسی کیسی صبر آزما ہی نہیں خرد آزما نفسیاتی کیفیات سے گذرنا پڑا ہوگا اس حقیقت کو میر صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔ اور پھر میر صاحب چونکہ اس صبر آزما کام سے محبوب کی گلی میں سے گذرے ہیں اس لیے اب یہ صبر آزما کام حسن و جمال سے لبریز کام بن گیا ہے۔ میر صاحب نے یہاں اپنا گریبان کیا چاک کیا ہے گویا طرح طرح کی خدمت گذاری کے بے شمار اجالوں کو عام کر دیا ہے۔ لیکن شعر زیر بحث میں میر صاحب نے جو ایک بہت ہی شائستہ اور ارفع و اعلیٰ قسم کی تعلّی سے کام لیا ہے اس کا بھی کوئی جواب نہیں۔ گویا میر صاحب اپنے اس عجز و انکسار کے رویے سے محبوب کی گلی کے لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اے لوگو تم خوش بخت اور خوش نصیب تو اس لیے ہو کہ محبوب کی گلی میں رہتے ہو لیکن کم بخت اور کم نصیب اس لیے ہو کہ محبوب کی گلی میں رہتے ہوئے بھی تم میں یہ شعور پیدا نہیں ہوسکا کہ تم کچھ مردم شناس بن جاتے اور آدمی کو پہچان سکتے کہ کون شخص کس قسم کا ہے۔ اور یوں تم میں شائستگی آجاتی یہ تو ایسا ہی ہے جیسے لوگ اللہ کی دنیا میں رہتے تو ہیں لیکن اللہ کی شان سے ذرا سے بھی واقف نہیں ذرا سا بھی لوگوں کو اللہ کا احساس نہیں ہوتا۔ معاف کیجئے یہاں یہ مثال دینے سے میری یہ مراد ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ میں میر صاحب کے محبوب کو معاذ اللہ خدا کا درجہ دے رہا ہوں۔ میں تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ محبوب تو گوشت پوست کا ایک جیتا جاگتا انسان ہوتا ہے اور ظاہر ہے جب وہ میر صاحب جیسے عاشق کا معشوق اور محبوب بنا ہے تو اس میں ضرور کوئی ایسا حسن و جمال ہوگا جس نے میر صاحب کو متاثر کیا لیکن محبوب کی گلی کے یہ لوگ اس قدر غفلت شعار واقع ہوئے ہیں کہ انہیں اتنا سا بھی احساس نہیں ہے کہ وہ کس قدر اونچے انسان کی گلی میں رہتے ہیں اور اس کے پڑوسی ہیں۔ یا کیسا خوبصورت انسان ان کا پڑوسی ہے ہم لوگوں کے اندھے ہونے پر بھی تو کوئی حد نہیں لگا سکتے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ تو میں نے عام بول چال سے متعلق میر صاحب کے ایک شعر کی مثال دی ہے اس طرح کے شعر نجانے ان کے دیوان میں کتنے موجود ہیں جن پر کوئی لکھنا چاہے تو بہت کچھ لکھ سکتا ہے۔

عام بول چال کے لہجے ہی کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے۔ دیکھئے اس میں عام بول چال کے لہجے کو کس قدر شائستگی اور بلندی میر صاحب نے عطا کر دی ہے۔

دو میٹھے بول ہم سے فقیروں کا مول ہے
تم خوب جانتے ہو کہ ارزاں نہیں ہیں ہم

اس شعر سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ میر صاحب اپنے محبوب یا دوست کے پاس آئے ہیں لیکن اس نے ان سے کچھ اچھی طرح بات نہیں کی اس پر میر صاحب نے دوست پر فوراً اپنی پوزیشن واضح کر دی۔ کہ میاں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ویسے بھی تم اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہو کہ ہم فقیر یعنی بے نیاز قسم کے لوگ ہیں ہمارے ملنے جلنے کی بنیاد تو انسان کی انسانیت ہے کوئی غرض یا طمع وحرص نہیں۔ ہم تو بے لوث ہو کر ملنے کے قائل نہیں۔ کوئی ہم سے ذرا میٹھے انداز میں گفتگو کر لیتا ہے تو ہم شاد آباد ہو جاتے ہیں۔ اوراس کے ایک طرح سے خادم بھی لیکن اگر کوئی ذرا کج ادائی دکھاتا ہے تو پھر کسی قسم کی برداشت کے قائل نہیں۔ کج ادائی میں انا کا حسن نہیں ہوتا جتنا کہ اخلاقی قدروں کے خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ادھر دو میٹھے بول اس لیے بے بہا ہوتے ہیں کہ ان سے انسانیت فروغ پاتی ہے۔ یوں فقیروں کے واسطے دو میٹھے بول انمول بھی ہوتے ہیں اور لاجواب بھی کہ ان کے سامنے فقیروں کی فقیری لاجواب ہو ہی نہیں جاتی لاجواب بن بھی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ شعر زیر بحث کا کمال یہ دیکھئے کہ اس میں لہجے کی کونسی ادا ہے جو نہیں سمودی گئی۔ بس ذرا توجہ کی ضرورت ہے۔ پہلی خصوصیت تو اس شعر کی یہ ہے کہ اس میں لہجے کے مفہوم کو ایک عجیب انداز سے وسعت دی گئی ہے۔ جب کہ آپ جانتے ہیں لہجہ حسب موقع ومحل بات کرنے کا نام ہے۔ یعنی لہجے میں وقت اور جگہ دوسرے لفظوں میں زمان ومکان کا بہت خیال ہی نہیں رکھا جاتا بلکہ لہجے کی بنیادی خصوصیت ہی زمان ومکان ہے۔ مگر دیکھئے شعر زیر بحث ہی زمان ومکان کو کس طرح وسیع ترین تناظر میں استعمال کیا گیا ہے۔

دو میٹھے بولوں کی لیے وقت کی کوئی قید نہیں اسی طرح ان کے لیے جگہ کی بھی کوئی قید نہیں۔ آپ جب چاہے اور جہاں چاہے انہیں بروئے کار لاسکتے ہیں۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ اگر کسی کو ڈرانا یا دھمکانا ہو تو اس وقت دو میٹھے بول کیسے استعمال کیے جاسکتے ہیں لیکن وہی بات ذرا غور کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے دو میٹھے بولوں کے ذریعے ڈرانے اور دھمکانے کا کام بھی لیا جاسکتا ہے اور زیادہ موثر طریقے سے۔ اب رہیں لہجے کی دوسری خصوصیات تو اس ضمن میں بھی شعر زیر بحث کے حوالے سے بہت سی باتیں کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً اس شعر میں تاکید Accentuation کا اس قدر خوب اظہار ہوا ہے کہ معنی ذرا بھی پوشیدہ نہیں رہے۔ پہلے مصرع کو دیکھئے وہ اپنے انداز میں تاکید کر رہا ہے۔ دو میٹھے بول ہم سے فقیروں کا مول ہے۔ دوسرے مصرع میں تاکید مزید کے طور پر سامنے آرہی ہے۔ تم خوب جانتے ہو کہ ارزاں نہیں ہیں ہم جس طرح اس شعر کے پہلے مصرع میں فقیروں کے لفظ میں تاکید کی کڑاوائٹ کو شیرینی میں بدلا ہے اسی طرح دوسرے مصرع میں ''تم خوب جانتے ہو'' کے ٹکڑے نے تاکید میں شدت پیدا کر دی ہے۔ اس کے علاوہ اس شعر میں لہجے کی ایک خصوصیت تبدیلی Modulation بھی ہے جی ہاں ایسی تبدیلی جس سے الفاظ کو اظہار کی قوت مل رہی ہے۔ اسی طرح میر کے اس شعر میں اور پورے کلام میں ''آواز'' اور ''لحن'' کے اتار چڑھاؤ یعنی Cadence کی بھی بہت خوبصورت مثالیں منہ بولتی تصویروں کے طرح ہماری سماعت کو بصارت اور بصیرت عطا کرتی ہیں۔

دراصل بقول شمس الرحمٰن فاروقی میر کے کلام کو تا حال غور سے نہیں پڑھا گیا اور یہ کوئی اتنا آسان کام ہے بھی نہیں۔ لیکن میر صاحب کے کلام کے ساتھ یہ ظلم بھی ہمارے قریب قریب تمام نقادوں نے حسن عسکری کو چھوڑ کر اس ایک غلط احساس کی وجہ سے کیا کہ میر کا لہجہ دھیما ہے حالانکہ جیسا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے خاص وضاحت سے کہا ہے کہ ایسی بات ہرگز ہرگز نہیں ہے بس وہی بات کہ ان نقادوں نے خواہ اس میں مجنوں گورکھپوری ہوں یا فراق گورکھپوری یا ڈاکٹر عبداللہ یا کوئی اور کلام میر کو پڑھنے کے

لیے جس توجہ کی ضرورت تھی اس توجہ سے نہیں پڑھا۔ اور اس نکتہ پر بھی غور نہیں کیا گیا کہ کلام میں درد و غم کے بیان سے کیا معنی مراد ہوتے ہیں یا کیا معنی مراد لینے چاہئیں۔ ہمارے میر صاحب نے تو اس کے برعکس یہی ثابت کیا ہے کہ درد و غم سے آدمی کو دبنے یا شکست کھانے کی ضرورت نہیں درد و غم کو طاقت بنانے کی ضرورت ہے جس کے باعث پھر آدمی اس شان سے جینا سیکھتا ہے کہ خود زندگی اس پر رشک کرنے لگتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میر کے لہجے کو دھیما تو ہر نقاد نے کہدیا یہ غور نہیں کیا کہ دھیمے لہجے سے کیا مراد ہوتی ہے۔ یا دھیما لہجہ کہتے کس کو ہیں۔ وہی بات کہ درد و غم کے لہجے کو دھیما لہجہ کہنا لہجے کی اصلیّت سے ناواقفیت کی دلیل ہے ورنہ دھیما لہجہ تو انسان کے یقین اعتماد اور وثوق کا لہجہ ہوتا ہے۔ اس لہجے میں جو ایک اپنے ہی انداز کی تمکنت پائی جاتی ہے اس پر بھی بہت کم غور کیا گیا ہے۔ میر کا لہجہ دراصل ایک اعتماد اور یقین کا لہجہ ہے جس کی توانائی کو بھی آسانی کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

جرعہ ہائے اشک

یہ بات تو طے ہے کہ جس طرح میر صاحب کی زندگی میں درد و الم کی پے در پے یورشیں ہوتی رہیں اسی طرح وہ اپنی شاعری کے بے پناہ ماحول میں آنسوؤں کے بے پناہ سیلاب پر سیلاب بھی لاتے رہے۔ آپ جانتے ہیں غموں کو برداشت کرنا ایسا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا جیسا کہ ہر غم پر آنسو بہانا مشکل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلسل رونا بہت حوصلے اور ہمت کا کام ہے یوں آنسوؤں سے دل ہلکا تو کبھی کبھی ہر کوئی کر لیتا ہے مگر شدت کے ساتھ آنسو بہتے ہیں تو انکے ساتھ جان کے بہہ جانے کا بھی پورا پورا خطرہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان آنسوؤں کے سیلابوں کو آدمی میں جھیل جانے کی قوت پیدا ہو جائے تو پھر یہی آنسو اس کے لیے ایک بہت بڑی توانائی بھی بن جاتے ہیں سو میر صاحب کے ہاں آنسو ایک توانائی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور جب گریہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اس میں ایک بہت اونچ نشے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ سب کرم دل پرخوں کی اک گلابی کا ہوتا ہے۔ یعنی آدمی جب تک حوصلے اور ہمت سے کام نہ لے کوئی بات نہیں بنتی۔ میر صاحب عمر بھر یہی حوصلہ دکھاتے رہے اس لیے عمر بھر ان تمام درد و الم کے باوجود ان کی حالت ایک بہت ہی باوقار قسم کے شرابی کی سی رہی۔ میں اصل میں میر صاحب کے چند اشعار گریہ سے متعلق پیش کر رہا ہوں۔ الگ الگ عنوان کے ساتھ۔ تا کہ میر صاحب کے گریہ کی ایک بھرپور صورت ہمارے سامنے آسکے۔

طوفانِ نوح

کل اک مژہ نچوڑے طوفانِ نوح آیا
فکرِ فشار میں ہوں میر آج ہر پلک کے

میر صاحب فرماتے ہیں کل کی بات ہے میں نے اپنی ایک مژہ نچوڑی تو طوفان نوح آ گیا۔۔۔۔ آج سوچ رہا ہوں کیوں نہ اپنی ہر ایک مژہ ہر ایک پلک نچوڑ دوں تا کہ طوفانِ نوح جیسے بے شمار طوفان آ جائیں۔ بظاہر یہ شعر ایک مبالغہ سا نظر آ رہا ہے لیکن ذرا غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ میر صاحب اپنے انداز میں آج تک کی پوری انسانی تاریخ کی واضح طور پر نشان دہی کر رہے ہیں۔ اپنے زمانے میں جب حضرت نوح اپنی امت کے لوگوں کی بداخلاقی بدکرداری اور طرح طرح کے ظلم وستم سے تنگ آ گئے تو انہوں نے یعنی حضرت نوح نے خدا سے دعا کی کہ اے خدا میں ان لوگوں کو سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ چکا ہوں اب تو ہی انہیں اپنے غضب سے راہِ راست پر لا سکتا ہے لہٰذا ان پر کوئی عذاب نازل کر تا کہ ان کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں اور یوں حضرت نوح کی امت پر ایک عظیم سیلاب کی صورت میں عذاب خدا اترا۔ لیکن میر صاحب کا کہنا ہے کہ لوگوں کو حضرت نوح کے طوفان ہی سے اپنے آپ کو راہِ راست پر لے آنا تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ طوفان نوح کے بعد سے آج تک دنیا کے انسانوں نے ایک دوسرے پر کیا کچھ ظلم وستم نہیں ڈھائے اس لیے اب تو ان پر طوفان نوح جیسا ایک طوفان نہیں بہت سے طوفان آنے چاہئیں تا کہ ان کے ہوش ٹھکانے لگیں۔ اور یوں میر صاحب نے پوری انسانی تاریخ پیش کرنے کے بعد نہایت خوبصورتی کے ساتھ گریہ و زاری کے عمل کو ایک پیغمبرانہ شان عطا کر دی۔ اور اپنا غصہ بھی نکال لیا۔

تمام کرۂ ارض

میر صاحب ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

کبھی جو آنکھ سے چلتے ہیں آنسو
تو پھر جاتا ہے پانی سب زمیں پر

اس شعر میں بھی بظاہر ایک بہت بڑا مبالغہ نظر آ رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے میری آنکھ سے یا ایک حساس آدمی کی آنکھ سے جب آنسو چلتے ہیں تو پھر تمام کرۂ ارض کی زمین پر پانی پھر جاتا ہے ساری زمین کو سارے کرۂ ارض کو اس کے آنسو سیراب کر جاتے ہیں۔ لیکن تھوڑے سے غور وفکر کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک حساس انسان جب روتا ہے تو اس کا رونا کسی ایک جگہ کے لیے نہیں ہوتا پورے کرۂ ارض کے انسانوں کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی دردمند آدمی روئے اور وہ اپنے دکھ کو اور اس کے علاج اور مداوے کو چند لوگوں تک محدود کردے۔ نہیں ایک دردمند انسان تو سب کے لیے اپنے دل میں درد رکھتا ہے۔ اور یاد رکھیئے وہی شخص اپنے دکھ کو اپنے درد کو وسعت بخش سکتا ہے جو صاحبِ حوصلہ اور ہمت والا ہوتا ہے یعنی وہ شخص جو اپنے دل پر خوں کی گلابی سے ایک توانائی کے ساتھ سرور وکیف کے عالم میں ہوتا ہے۔

تلاطم

آنسو کیسے تلاطم بنتا ہے کس طرح یہ اپنی صورت میں آتا ہے۔ گویا میر صاحب نے اپنے ایک شعر میں آنسو کے سفر کو قلمبند کیا ہے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ آنسو ایک معمولی چیز سے کیونکہ غیر معمولی چیز بن جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

جگر ہی میں قطرہ خوں ہے سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

آنسو اپنی پہلی صورت میں خون کے ایک قطرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور یہ خون کا قطرہ بھی اسی صورت میں ہوتا ہے۔ اگر اس میں خلوص شامل ہو۔ گویا خلوص کے بغیر تو وہ ایک قطرۂ خون بھی کہلانے کا حق دار نہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ صحیح معنی میں آنسو کہلانے کے لیے اس میں خلوص ایک شرطِ اولین ہے۔ اور جب اس میں خلوص شامل ہو گیا اور آپ اس معمولی سے قطرۂ خون کو پورے شعور اور درد مندی کے ساتھ اپنی پلک تک لے آئے تو بس اب یوں سمجھئے وہ کوئی معمولی قطرۂ خون نہیں رہا۔ وہ اپنی طاقت کے اعتبار سے ایک تلاطم ایک طوفان کی صورت اختیار کر گیا۔ لیکن یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ صاحب اس دنیا میں آنسوؤں کی کوئی کمی ہے چاروں طرف اتنے دکھ درد پھیلے ہوئے ہیں کہ جن کی وجہ سے ہر آنکھ میں آنسوؤں کے علاوہ اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

لیکن ذرا توجہ سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خلوص جذبات کے تحت تو عام آنکھ میں بھی آنسو کا آجانا ایک فطری بات ہے خلوص جذبات کے ساتھ ساتھ فکر و ہمدردی کے خلوص کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ کیونکہ ایک آنسو میں محض ایک جذبہ کوئی بڑی طاقت پیدا نہیں کرتا اس کی اصل طاقت اور پائیداری درد مندی اور تفکر و تعقل سے پیدا ہوتی ہے۔ اور تفکر و تعقل کے لیے آپ جانتے ہیں دل پر خون کی ضرورت ہے۔ یعنی حوصلہ اور ہمت کی۔

اعتبارِ گریہ

آنسو قابل اعتبار کب ہوتے ہیں؟ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے میر صاحب نے ایک بہت خوبصورت اور عمدہ شاعرانہ توجیہ بیان فرمائی ہے۔ ان کا ایک

شعر ہے۔

یوں دور سے کھڑے ہو، کیا معتبر ہے رونا
دامن سے باندھ دامن اے ابرتر ہمارا

فرماتے ہیں اے بادل تم جو یوں ہم سے دور کھڑے ہو کر رو رہے ہو تو تمہارا یہ رونا معتبر رونا نہیں ہے۔ کیونکہ تنہا ہو کر رونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا درد تمہارا دکھ تمہارا غم کوئی بہت ہی محدود قسم کا ہے۔ گویا تنہا رونا خود غرضی کے رونے میں نہایت آسانی کے ساتھ شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی واقعی کسی کی ہمدردی میں رو رہا ہے تو اس کے اس رونے میں اتنا اثر اتنی طاقت ضرور ہونا چاہئے کہ وہ اپنے اس گریہ میں دوسروں کو بھی شامل کر لے تاکہ جس دکھ کی وجہ سے کوئی تنہا کھڑا رو رہا ہے اُسے آسانی کے ساتھ دور کیا جاسکے۔ یہاں پر یہ اعتراض بڑی بے تکلفی سے کیا جاسکتا ہے کہ ٹھیک ہے بادل تنہا کھڑا رو رہا ہے۔ لیکن اس کا رونا اس زمین کو تو پوری طرح فائدہ پہنچا رہا ہے جہاں یہ بادل برس رہا ہے یا شاعرانہ زبان میں رو رہا ہے۔ ایسی صورت میں بادل سے یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ وہ ہمارے دامن کے ساتھ اپنا دامن جوڑے....... اصل میں اس طرح کا اعتراض وہی حضرات کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں جو ادب کی زبان اور مزاج سے واقف نہیں ہوتے اور پھر یہ بھی درست ہے کہ آجکل جلدی سے کتنے لوگ ادب پڑھتے ہیں۔

تاہم اس اعتراض کا جواب پیش خدمت ہے۔ ٹھیک ہے اگر کوئی بادل تنہا کھڑا رو رہا ہے یعنی برس رہا ہے تو اس کا پانی زمین پر گر رہا ہے اور وہ سیراب بھی ہو رہی ہے مطلب یہ ہے کہ بادل کے برسنے کا فائدہ واضح ہے لیکن بادل کے اس برسنے کے کیا معنی اگر اس علاقے کے لوگ بادل کے اس برسنے کے فوائد سے غافل ہیں۔ ویسے بھی جب انسان فطرت کے کاروبار میں خود شامل نہیں ہوتا اُس وقت تک کسی بھی فعل کا کیا اعتبار..... باہر کی دنیا اور اندر کی دنیا کے اتصال ہی سے اس زندگی کے کوئی معتبر معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اور دردمندی کے معنی تو اس اتصال کے بغیر اپنا کوئی وجود ہی نہیں

رکھتے۔ اور آخر میں پھر وہی بات کہ اتصال کو مضبوط بنانے والی چیز دل پر خون کی گلابی ہی ہے جس کی وجہ سے ہمارے میر صاحب عمر بھر شرابی سے لگتے رہے۔

سمندر کا بلونا

میر صاحب نے ایک بالکل نئے انداز سے ہمیں اپنے ایک شعر میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ رونا، اشک بہانا بہت اچھی بات ہے لیکن رونے میں اپنے ہوش وحواس کو گم نہیں کر دینا چاہئے ورنہ ایسا رونا محض جذباتیت کی سطح سے اوپر نہیں اٹھنے دیتا۔ اور جب اشکباری میں محض جذباتیت ہو تو وہ کسی طرح بھی سود مند ثابت نہیں ہو سکتی۔ یا ایسی اشکباری کو ہم کسی طرح بھی وقیع قرار نہیں دے سکتے۔ اس کے علاوہ جذباتی قسم کی گریہ وزاری کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس اشکباری میں ہم جو کچھ کھو بیٹھتے ہیں اسے دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اور یوں اشکباری کا یہ عمل خواہ مخواہ طول پکڑتا چلا جاتا ہے۔ میر صاحب کا وہ شعر یہ ہے۔ دیکھ لیجئے منفی انداز کی بات میں بھی تشبیہ و استعارہ نے کیا خوبصورتی پیدا کی ہے۔

پایا نہ دل بہایا ہوا سیل اشک کا
میں پنجۂ مژہ سے سمندر بلو چکا

اس شعر میں پنجۂ مژہ سے سمندر بلونے کی جو بات کی گئی ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ واقعی ہوتا یہی ہے کہ مژہ پر ایک ایک آنسو آتا ہے اور پھر نیچے گرتا ہے اور زار و قطار رونے میں اس عمل کو ہم آسانی کے ساتھ بلونے کے عمل سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور سمندر والی بات یہ ہے کہ میر صاحب کے پاس ہر طرح کے آنسوؤں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ البتہ اس شعر میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ سیل اشک کو بھی آخر سمندر ہی میں گرنا تھا پھر اس سیل اشک کے ساتھ بہنے والا دل کہاں چلا گیا لیکن یہ بھی تو ضروری نہیں کہ سیل

میں بہی ہوئی ہر چیز سمندر ہی میں جا کر گرے۔ سمندر بلونے کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔

سیر گریہ

رونے سے کس طرح سیلاب آتے ہیں؟ رونے کا اصل مقصد کیا ہے؟ آنسوؤں کی بارشیں کہاں ہوتی ہیں ان کا کام کیا ہے؟ اس طرح کے سب سوالات کا جواب میر صاحب نے اپنے ایک شعر میں دیا ہے۔ اور شہر کے استعارے کو باطن کی دنیا کے لیے کس آسانی کے ساتھ برتا ہے یہ سب کچھ میر صاحب کے اس شعر میں ملاحظہ فرمائیے۔

ٹک شہر سے نکل کے مرا گریہ سیر کر
گویا کہ کوہ و دشت میں برسات ہوگئی

یعنی شاعر مشورہ دے رہا ہے کہ اے دوست تو جو میرے رونے پر خواہ مخواہ معترض ہوتا رہتا ہے ذرا میرے باہر کی دنیا کو چھوڑ کر میرے باطن کی وسیع و عریض دنیا میں جھانک کر دیکھ کہ کس طرح میرے باطن کے نشیب و فراز یعنی کوہ و دشت کو میرے آنسوؤں نے دھو کر نکھار کر سنوار کر برسات کے سے موسم سے دوچار کر دیا ہے۔ اور کس طرح مجھے آنسوؤں نے تازگی اور فرحت بخشی ہے آنسوؤں کے حوالے سے یہ سب نظارہ کرنے کی ضرورت ہے۔ عام لوگوں کی طرح گریہ وزاری کے ظاہر تک ہی خود کو محدود نہیں کر دینا چاہئے۔ بلکہ ہر رونے والے کا صحیح معنی میں دردمند بن کر اس کے باطن میں جھانکنا چاہئے کہ اصل حقیقت کا اسی جگہ سے نظارہ ہوسکتا ہے۔ اور اندر کی دنیا ہی بتا سکتی ہے کہ گریہ وزاری کے اصل معنی کیا ہیں۔ ہم اپنے اندر کی دنیا میں اگر جھانکنے کی ہمت کر سکیں تو نہیں پر ہمیں اپنے آنسوؤں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے ..... ورنہ ظاہر کی دنیا میں تو آنسو نمکین پانی سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے...... اسی طرح کا

میر صاحب کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمالیجئے۔

جنگل ہی ہرے تنہا رونے سے نہیں میرے
کوہوں کی کمر تک بھی جا پہنچی ہے سیرابی

اسی مفہوم کا ایک اور شعر بھی سن لیجئے۔

جل تھل فقط نہیں مرے رونے سے بھر گئے
جنگل پڑے تھے سوکھے سودہ بھی ہوئے ہرے

آنسوؤں کی رسائی

آنسوؤں کے لیے جس قدر بلند مقام آپ مہیا کریں گے اسی حساب سے آپ کو آپ کی گریہ و زاری کا جواب بھی ملے گا۔ میر صاحب ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

دامانِ کوہ میں جو میں دھاڑ مار رویا
اک ابرداں سے اٹھ کر بے اختیار رویا

دامانِ کوہ میں دھاڑ مار کر رونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بلند اور کھلا ماحول ہی آنسوؤں کی قدر و قیمت کو پہنچان سکتا ہے۔ اس لیے جیسے ہی میں نے دامانِ کوہ میں دھاڑیں مار کر رونا شروع کیا میرے جواب میں ہمدردی کے طور پر فوراً بادل کا ایک ٹکڑا اٹھا اور خوب زور سے برس پڑا...... اگر میں نیچے کہیں شہر یا بازار میں اس طرح رونا شروع کرتا تو لوگ میرا مذاق ہی اڑاتے اس لیے کہ لوگوں کے ذہن گریہ وزاری کی وقعت کو ابھی تک نہیں سمجھ سکے۔ گریہ و زاری کی وقعت کو سمجھنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ گریہ وزاری کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ ہم بطور ابنائے جنس ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو پہنچاننے کا زیادہ سے زیادہ شعور رکھتے ہوں ورنہ آنسوؤں کی رسائی تو ہر کہ

دمہ تک شادابی کے طور پر ہوتی رہتی ہے۔

طوفانی کشتی

ایک بڑے شاعر کی طرح میر صاحب جو تشبیہ سے اپنے شعر کو بادہ معنی و مفہوم سے بھر دیتے ہیں اس کا بھی کوئی جواب نہیں۔ اپنے ایک شعر میں میر صاحب بتانا یہ چاہتے ہیں کہ آنکھ میں آنسو کا ہونا ایک نیک شگون ہے لیکن آنکھ کا آنسوؤں سے بھر جانے کی ایک حد ہے۔ اگر یہ حد قائم نہ رہے تو پھر خطرے کی بات ہے۔ لیکن غموں کی شدت کے باعث ایسا ہو جاتا ہے تو ایسے وقت میں ایک انسان کو اگر کوئی چیز بچاتی ہے تو وہ دل پرخوں کی گلابی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔ گویا دل پرخوں کی یہ گلابی ایک وارننگ تنبیہہ کا کام بھی سرانجام دیتی ہے جس طرح اس شعر میں ہو رہا ہے۔

چشم ہوتے ہوتے تر کچھ سب بھری رہنے لگی
اب ہوئی خطرے کی جاگہ کشتی طوفانی ہوئی

مطلب یہ ہے کہ جس طرح بھی ہے اب اس طوفانی کشتی کو بچانے کی ضرورت ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میر صاحب نے اپنے اِس شعر میں بچانے کی کوئی بات نہیں کی بس ایک ہمدرد کے طور پر وارننگ ضرور دی ہے۔

اشک بطور قاصد

قدم آگے بڑھاتی ہوئی روایت کو اس کا اپنا مقام دیتے ہوئے ایک نئی روایت قائم کرنا بھی کوئی ہمارے میر صاحب سے سیکھے۔ صبا کو پیغام بر بنانا یا پیغام بر کا رُتبہ بخشنا ہماری اردو غزل کی ایک عام سی آگے بڑھتی روایت ہے (ہوا کو آپ آگے بڑھتی ہوئی

نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے) ہاں تو میر صاحب صبا کو اس رتبے سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن بڑے سلیقے سے یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں بلکہ جتانا چاہتے ہیں کہ پیغام بری کے ضمن میں عاشق کو بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے کہ یہ بہت ہی نازک منصب اور مرتبہ ہے۔ اور اس منصب کی نزاکت کے پیش نظر یہ ضروری قرار پاتا ہے کہ ہم ایسی شے کو اپنا پیغام بر بنائیں جس کا تعلق خاص طور سے ہماری ذات کے ساتھ مضبوط قسم کا ہو۔ چنانچہ دیکھئے مندرجہ ذیل شعر میں میر صاحب کس طرح اپنے ایک گرم گرم آنسو کو مرتبہ پیغام بری بخش رہے ہیں۔

کم نہیں کچھ صبا سے اشک گرم
قاصد پرشتاب ہے وہ بھی

صبا کا معشوق کو پیغامِ عاشق پہنچانا اپنی جگہ تسلیم لیکن گرم گرم آنسو بھی ایک پرشتاب قاصد یعنی عجلتوں اور جلدیوں سے بھرا قاصد اور پیغام بر ہوتا ہے کیونکہ صبا معشوق کی گلی میں یا خود معشوق کے گھر عاشق کا پیغام تو ضرور پہنچا سکتی ہے اور پہنچا دے گی لیکن یہ ضروری نہیں کہ صبا کا یہ پیغام معشوق تک بھی پہنچ جائے۔ ویسے بھی سچ پوچھا جائے تو عاشق لوگ صبا کو جو اپنا پیغام بر بناتے ہیں وہ مجبوری کے تحت اپنے دل کی تسلی کے لیے ایسا کرتے ہیں ورنہ حقیقت میں صبا کی حیثیت پیغام بر کے طور پر مخدوش ہی رہتی ہے۔ بہرحال صبا کی پیغامبری سے خواہ مخواہ انکار بھی کیوں کیا جائے۔ لیکن اشکِ گرم جی ہاں عاشق کی آنکھ کا گرم گرم آنسو صبا سے پہلے معشوق تک عاشق کا پیغام اس طرح پہنچا سکتا ہے کہ جو بھی عاشق کے آنسو دیکھے گا وہ فوراً اس کے معشوق کو اس کی اطلاع دے گا۔ اس کے علاوہ یہ آنسو خود معشوق بھی دیکھ سکتا ہے۔ اور اس کے دیکھنے سے اس کے دل میں یعنی معشوق کے دل میں عاشق کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ان سب باتوں کو بھی ایک طرف رکھیے۔ خود یہ بات کس قدر پرلطف ہے کہ ہم ایک پرانے پیغام بر کو چھوڑ کر ایک نیا پیغام بر بنا رہے ہیں جس سے خواہ مخواہ بھی نئی نئی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ اور آخری بات یہ ہے کہ صبا کی جگہ آنسو کو پیغام بر بنانا

ایک جرأت اور ہمت کا کام ہے۔ صبا کو پیاسی بنانا تو نرا گریز ہے۔

ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے

عاشقوں پر باہر کے عام موسموں کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ دوسرے لفظوں میں عاشق لوگ اپنے باطن کی طراوت سے زیادہ فیض یاب ہوتے ہیں۔ بنیادی بات تو میر صاحب یہی کہنا چاہتے ہیں لیکن یہ بات قاری پر اپنا شدید تاثر نہیں چھوڑتی جب تک اس بات کو ایک نیا رخ نہ دیا جائے۔ پھر میر صاحب یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ عاشق لوگ ہرے ہونے اور سوکھے ہونے کی حالت سے ہمہ وقت بلند رہتے ہوئے سرسبز وشاداب ہونے کو بھی فراموش نہیں کرتے یعنی شاداب ہونا تو بے حد ضروری ہے۔ جو شخص اپنی زندگی میں سرسبز و شاداب نہیں تو سمجھ لیجیے وہ کچھ بھی نہیں۔ بات تو اس سے بھی آگے جانے کی ہے جو بڑے بڑوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ بے حد سلیقے کے ساتھ میر صاحب اپنے مندرجہ ذیل شعر میں اپنی اس کمی کو بھی کہہ گئے ہیں لیکن ان کی اس فریاد کو سُننے کے لیے ہمیں اپنی خاص سماعت سے کام لنیا پڑتا ہے اور خاص طور سے شعر کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ شعر یہ ہے۔

ساون ہرے نہ بھادوں میں سوکھے ہم اہل درد
سبزہ ہماری پلکوں کا سیراب تھا سو تھا

گویا زندگی کی تمام تر شادابی کی لاج اگر کوئی چیز رکھتی ہے تو وہ پلکوں کا آنسوؤں سے سیراب ہونا ہے۔ اور وہ چیز میر صاحب کو نصیب تھی مگر دیکھ لیجیے شعر کے دوسرے مصرع کے آخری دو نہایت مختصر اور معمولی سے لفظ ''سو تھا'' نے کمال بلاغت کے ساتھ میر صاحب کی تشنگی کو واضح کر دیا۔ سبزہ ہماری پلکوں کا سیراب تھا سو تھا۔ یعنی پلکوں کی سیرابی سے بات آگے نہیں بڑھی۔ گویا میر صاحب نہایت عجز وانکسار کے ساتھ

ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ وہ کوئی خاص شخصیت کے مالک نہ تھے ہمارے اور آپ جیسے عام آدمی تھے۔ سو تھا کے دو لفظوں سے حسرت کا بھی پورا پورا اظہار ہو رہا ہے۔

سبزہ کو دھوپ دکھانے کی بات

میر صاحب کے سامنے پھر مژگان تر کا مسئلہ ہے۔ لیکن اس مسئلے کو میر صاحب نے جس طرح حل کیا ہے اسکی داد نہ دینا بھی ایک بہت بڑی نا انصافی ہوگی۔ میرا خیال ہے میں پہلے میر صاحب کا وہ شعر لکھدوں جس پر مجھے اس وقت بات کرنی ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

مژگانِ تر کو یار کے چہرے پہ کھول میرؔ
اس آب خستہ سبزے کو ٹک آفتاب دے

اس شعر میں میر صاحب نے پلکوں کو آب خستہ سبزہ یعنی پانی کا مارا ہوا یا پانی سے برا حال سبزہ کہا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ پلکیں ہر وقت آنسوؤں سے بھیگی رہتی ہیں۔ اور پلکوں کا اس طرح ہر وقت بھیگا رہنا کوئی اچھی بات نہیں پلکوں کا صحت مند ہونا نہ صرف آنکھوں کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ جمالیات کا سوال بھی ہے۔ چنانچہ پلکوں کو سورج کی روشنی دینے کے لیے اس سے بہتر تجویز کیا ہوسکتی ہے کہ محبوب کے چہرے کے آفتاب سے ان کو منور اور مشرف کیا جائے۔ پھر اس تجویز میں جو میر صاحب نے نزاکتیں بھری ہیں ان کی داد دینا ان کا ذکر کرنا بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمایئے میر صاحب ارشاد کر رہے ہیں کہ اے میر اپنی پلکوں کو یار کے چہرے پر کھولو۔ یار کے چہرے کی دھوپ پڑے گی تو نہ صرف پلکوں کے وارے نیارے ہو جائیں گے عاشق کی پوری ذات میں ایک نئی امنگ اور ایک نئی روشنی دوڑ جائے گی۔ لیکن میر صاحب نے اس شعر کے دوسرے مصرع میں ٹک کا جو لفظ استعمال کیا ہے اس کی نزاکت کی داد دینا بھی

کوئی آسان کام نہیں ۔ پلکوں کو یار کے چہرے پر ضرور کھولو۔ لیکن ٹک یعنی محض ایک لمحے کے لیے کہ اس سے زیادہ کھولنے کی تم میں تاب ہی نہیں ہے لہٰذا عزت اسی میں ہے کہ خود بے حد احتیاط سے کام لو۔

خورشید رُو کی جستجو

آئیڈیل کی جستجو آئڈیل کی تلاش ایک اعلیٰ انسانی زندگی کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ جبکہ اس مسئلے کے ساتھ ایک خوبصورت پخ یہ بھی لگی ہوئی ہے کہ آئیڈیل ہمارے سامنے ہر وقت موجود ہے وہ ہماری زندگی میں **Real** کی طرح ہے حاضر و ناظر بھی ہے ہم اسے دیکھتے ہیں وہ ہمیں دیکھتا ہے لیکن اس ایک حقیقت کے باوجود ہم آئیڈیل کی جستجو میں ہر وقت لگے رہتے ہیں۔ ہمارے میر صاحب نے اس بارے میں مندرجہ ذیل شعر کہا ہے۔

کیا کم اس خورشید رُو کی جستجو یاروں نے کی
لو ہو روتے جوں شفق پورب گئے پچھم گئے

ایک تو میر صاحب نے اس شعر میں ان لوگوں کو داد دی ہے جو آئیڈیل کی تلاش میں پورے خلوص کے ساتھ مشرق مغرب میں آتے جاتے رہے۔ دوسرے اس جستجو کی انہوں نے تصدیق بھی کی ہے۔اور پھر یہ بھی بتایا کہ اس تلاش میں ناکام ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ایک تو وہ آئڈیل خورشید رو ہے یعنی سورج جیسے چہرے والا کہ وہ اپنے آپ کو چھپانا بھی چاہے تو کسی طور نہ چھپ سکے دوسرے ان جستجو کرنے والوں کا رخ اور سمت بھی درست تھا۔ کسی خورشید رو کو کسی سورج کو اگر تلاش کرنا ہو تو مشرق اور مغرب کے علاوہ اور کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان تمام حقائق کے باوجود تلاش کرنے والے اپنے اس آئیڈیل کا اپنے اس خورشید رو کا کچھ پتا نہ چلا سکے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تلاش کرنے والوں کے خلوص کی وجہ سے اپنے اس طرح

لہو رونے کی وجہ سے انہیں شفق کی طرح بلند مقام بھی حاصل ہوتا رہا یعنی اس خورشید رو کے طلوع ہونے سے قبل بھی یہ تلاش کرنے والے وہاں شفق کی صورت میں موجود تھے لیکن جیسے ہی وہ خورشید رو سامنے آیا اسے تلاش کرنے والے یہ لوگ نجانے کہاں غائب ہوگئے۔ اسی طرح تمام دن اس خورشید رو کو تلاش کرنے والے مارے مارے پھرتے رہے اس خورشید رو کا انہیں کچھ پتا نہ چلا لیکن جب وہ خورشید رو چھپ گیا تو یہ تلاش کرنے والے پھر شفق کی صورت میں عین وہیں نمودار ہوگئے جہاں وہ خورشید رو چھپا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ تلاش کرنے والوں کی سمت آخر وقت بھی درست تھی۔ مزید لطف کی بات یہ ہے کہ شعر زیر بحث کی بحر اس قسم کی ہے کہ اس سے بھی صاف طور پر تلاش کرنے والوں کی تگ ودو کا پتا چل رہا ہے۔ پورب گئے۔ پچھم گئے کے ان دو ٹکڑوں پر غور فرمایئے کس طرح ان تلاش کرنے والوں کے قدموں کی چاپ پورے شعر میں سنائی دینے کے بعد یہاں آ کر ختم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

چشم تر کا فیض

چشم تر یعنی روتی ہوئی آنکھ کو ابر سے تشبیہ دینا ہماری اردو غزل کی ایک پرانی روایت ہے لیکن میر صاحب نے اس پرانی روایت سے جس جس طرح نئے نئے انداز میں فائدے اٹھائے ہیں اس کی مثال بھی کم از کم اردو غزل میں اور کہیں اس طرح دکھائی نہیں دیتی۔ میر صاحب رونے کے رسیا تو بالکل نہیں تھے لیکن وہ روتے بہت تھے۔ اس لیے نہیں کہ رونا صرف وقت کی ضرورت تھی بلکہ اس لیے بھی کہ تا حال رونا زندگی کی بھی ضرورت ہے۔ یوں آپ ہزار قہقہے لگائیں ہزار خوشیاں منائیں لیکن جبتک آپ کی آنکھ آنسو سے محروم ہے زندگی آرام سے سانس لیتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ ابھی تک خوشی میں زندگی کی سانس پھولتی ہوئی ہی تجربے میں آئی ہے۔ ہاں تو میر صاحب کا شعر ہے۔

فیض اے ابر چشم تر سے اٹھا
آج دامن وسیع ہے اِس کا

دوسرے مصرع میں لفظ آج سے پتا چل رہا ہے میر صاحب کے چشم تر کا دامن پہلے وسیع نہیں تھا۔ میر صاحب کے رونے کے تجربے میں یک لخت وسعت پیدا نہیں ہوگئی رفتہ رفتہ اس تجربے نے وسعت پائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے میر صاحب کا گریہ صرف ان کے باطن کو فیض یاب کر رہا تھا آج اس میں اتنی طاقت اور وسعت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ غیر ذات کو بھی فیض پہنچا سکتا ہے۔ رونے کی تجربے کا پہلے ظاہر سے باطن کی طرف سفر تھا اور اب یہ سفر باطن سے ظاہر کی طرف ہو رہا ہے تو یقیناً اب اس تجربے میں زیادہ استحکام پیدا ہوا ہے۔ چشم تر کا دامن وسیع ہوتا ہے تو ابر اس سے اس طرح فیض اٹھاتا ہے کہ اس کا برسنا خلق خدا کے لیے باعث رحمت ہوتا ہے۔ چشم تر ابر کو سیلاب بن جانے سے روکتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا یعنی ابر کا ایک ایک قطرہ خیروخوبی کی دولت برساتا ہے۔ میر صاحب بھی تو اپنی چشم تر سے خیروخوبی کے طوفان اٹھانا چاہتے تھے۔ اس لیے یہاں ابر کو بھی معنوی فیض اٹھانے کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہم اس شعر کے مفہوم کو کس طرح صرف مادی اطراف میں مقید کر سکتے ہیں۔

خود آنسو سیلاب کب بنتے ہیں

لطف کی بات یہ ہے کہ چشم تر باہر کے سیلاب روکتی ہے لیکن خود باطن کے سیلابوں سے بھری ہوتی ہے اور آپ جانتے ہیں باطن کے سیلاب کتنے بھی تند و تیز کیوں نہ ہوں وہ آبادیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے البتہ بربادیوں کو ضرور اپنے ساتھ بہا کر لے جانا چاہتے ہیں۔ اور وہ ایسا کر کے بھی دکھا دیتے ہیں۔ اب یہ پھر ایک الگ بحث ہے کہ بربادیوں کا ملبہ پڑا ہوا تو دکھائی دیتا ہے اگر اسے اٹھا لیا جائے تو پھر سرے سے

اس کا احساس ہی نہیں رہتا کہ یہاں کبھی وہ ملبہ بھی پڑا تھا۔ لیکن انسان جو آبادی کی نسبت بربادی پر زیادہ تلا ہوتا ہے اور چشم تر کی طرف سے اسے وارننگ کے طور پر مختلف قسم کے اعلانات جاری ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کا ایک اعلان میر صاحب کے اس شعر میں بھی موجود ہے۔

سیلاب ہر طرف سے آئیں گے بادیے میں
جوں ابر روتے ہوگا جس دم گذر ہمارا

مطلب یہ ہے کہ اگر شر کا عمل جاری ہے تو خیر کے عمل کی تیاری بھی ساتھ ہی ساتھ چلتی رہتی ہے۔ خواہ وہ وقتی طور پر محض زبانی کلامی محسوس ہو رہی ہو۔ آخر ہم زبان وکلام کی حرمت سے بھی تو انکار نہیں کر سکتے۔ باقی رہا یہ سوال کہ میر صاحب اپنی گریہ وزاری کو قیامت آمیز اور قیامت خیز انداز میں کیوں پیش کرتے ہیں اس ضمن میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ شدت غم و آلام کو توڑنے کے لیے وہ ایسا کرتے ہیں اس کے علاوہ انہیں زبان کے محکم اثرات کا بھی پورا پورا احساس ہے آپ کسی بات کو ہزار زبانی کلامی کہہ کر اس کو عملی و تاثیری نتائج سے عاری ثابت کرنا چاہیں مگر اسے کلی طور پر عمل اور اثر سے محروم نہیں کر سکتے۔ جب کوئی بات منہ سے نکلتی ہے تو اس کے لیے نزدیک یا دور کوئی نہ کوئی میدان عمل تیار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ تو میر صاحب مستقبل کی بات کر رہے ہیں۔ اسی بات کو ماضی میں لے جا کر دیکھئے موصوف کیا فرما رہے ہیں۔

اک وقت رونے کا تھا ہمیں بھی خیال سا
آتے تھے آنکھوں سے چلے سیلاب روز و شب

ایک اور شعر سماعت فرمائیے۔ یہاں بھی ماضی ہی کا ذکر ہے۔

اک وقت ہم کو تھا سر گریہ کہ دشت میں
جو خار خشک تھا سو وہ طوفاں رسیدہ تھا

اگر ہم ان اشعار کو میر صاحب کی ذات تک بھی محدود کرتے ہیں تب بھی ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جس طرح کے الم ناک حالات سے وہ برسرِ پیکار رہے ان

کے دل کو حوصلہ دینے کے لیے بھی ان کا یہ انداز قابل ستائش ہی قرار پاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آنسوؤں اور گریہ وزاری سے متعلق کوئی ذکر میر صاحب کی کمزوری کو ظاہر نہیں کرتا۔ یہ سب ان کے کردار کی توانائی کے مظہر ہیں۔

چشم تر اور بادل

عموماً کیا خصوصاً بھی غزل میر میں بادل انسان کی چشم تر کا ممنون احسان ہی رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ برسنے برسانے میں بادل کا نہیں آنسو برساتی آنکھ کا ہی پلہ بھاری ہے۔ اور اس سے میر صاحب کی مراد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی کہ زندگی کو خارجی اور اندرونی طور پر جو چیز سرسبز وشاداب رکھتی ہے وہ عام برستے ہوئے بادل نہیں بلکہ آنسو برساتی آنکھ ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ آنکھ سوچ سمجھ کر آنسو برساتی ہے اور بادل مجبوری سے قوانین فطرت کے تحت اپنے آپ کو برساتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آنسوؤں کے برسنے میں جو شدت اور فراوانی ہوتی ہے اس کا احساس ہمیں اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک ہم بادل کو تشبیہ کے طور پر اس کے سامنے نہیں لے آتے۔ اس سے بھی آگے بڑھیے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بادل چاہے کتنے بھی زور سے برسیں ان کے برسنے میں کتنے بھی سیلاب کیوں نہ آجائیں وہ انسان کی آنکھ کے برسنے کا پھر بھی کسی طرح سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس تشبیہ و استعارے کے کھیل سے اگر اور کچھ نہیں تو نفسیاتی طور پر انسان کو اپنی حیثیت کے کارآمد اور موثر ہونے کا احساس رہتا ہے۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں زمین پر مضبوطی کے ساتھ قدم جمانے کا احساس اس نفسیاتی وسیلے کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے یا وسیلے سے کم از کم ابھی تک حاصل نہیں ہو سکا۔ چنانچہ جب میر صاحب اس زور شور سے کوئی بات کرتے ہیں تو ہزار مبالغے سے آراستہ ہونے کے باوصف وہ نہ صرف ہمیں ایک حقیقت نظر آتی ہے۔ بلکہ واقعی حقیقت ہوتی ہے۔ اسی وثوق کے ضمن میں میر صاحب کا یہ شعر آپ ملاحظہ فرمائیں

گے تو آپ کو میرے اس بیان کی صداقت کا علم ہوگا۔

لیتا ہے ابر اب تئیں اس ناچے سے آب
روئے ہیں ہم بھی برسوں تئیں زار زار کیا

اس شعر کی ساری صداقت کا راز اس کے دوسرے مصرع کی صداقت سے تعلق رکھتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ میر صاحب زندگی میں بہت روئے ہیں اور بڑی مضبوطی کے ساتھ روئے ہیں۔ کسی قسم کی بھی کمزوری کو ظاہر کیے بغیر رونا اپنی ذات ہی کو نہیں غیر ذات کو بھی سیراب کرنے کے مترادف ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میر صاحب کی ایک زبردست خواہش یہ بھی رہی ہے کہ ان کے آنسو دُنیا بھر کے درد وغم کو بہا کر لے جائیں۔ آنسوؤں کے ذریعے درد وغم کا یہ علاج بظاہر کچھ عجیب سا نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی غم کے مداوے کی پہلی شرط یہی ہوتی ہے کہ ہمیں اس کا احساس بڑی شدت کے ساتھ ہو۔ شدت احساس کے بغیر دنیا کی کوئی گتھی کوئی پرابلم بھی سلجھائی نہیں جاسکتی۔ آج دنیا میں جو درد و آلام کی بہتات ہے کثرت ہے اس کی وجہ بھی دراصل یہی ہے کہ آدمی اپنے درد و آلام کو پوری طرح درد مندی کے ساتھ دور نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی لاشعوری کوشش تن آسانی کے باعث یہی ہوتی ہے کہ یہ تمام دکھ درد معمولی سی کوشش کے نتیجے میں دور ہو جائیں۔ لیکن اس طرح کیسے کوئی غم دور ہوسکتا ہے چنانچہ اسی لیے دنیا کے بہت سے آلام جوں کے توں موجود ہیں۔

ایسی صورت میں میر صاحب کو جب یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی گریہ وزاری میں ایک توانائی آ گئی ہے تو فرطِ مسرت سے جھوم اٹھتے ہیں اور یوں اپنے آپ کو تسلی دے رہے ہیں۔

چشم بددور چشم تر اے میر
آنکھیں طوفان کو دکھاتی ہے

لیکن آنسوؤں میں توانائی کی بات نرمی دل کی تسلی کے لیے بھی نہیں ہے۔ دکھ

درد کے باوجود انسان کا سینہ تان کر مقابلہ کے لیے سامنے آ جانا بھی کوئی معمولی بات نہیں۔

مگر مقابلہ کے لیے سینہ تان کر سامنے آ جانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر آپ مقابلے کے لیے سینہ تان کر محض کھڑے ہو جاتے ہیں اور دشمن پر کوئی حملہ نہیں کرتے تو یہ تمام صورت حال ایک مذاق بن سکتی ہے۔لہٰذا میر صاحب ایسا حقیقت پسند شخص اس بات کو کسی طرح گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں کہ آپ محض سینہ تان کر کھڑے تو ہو جاتے ہیں آگے نہیں بڑھتے۔ ایسی صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے میر صاحب فرماتے ہیں۔

قطرہ قطرہ اشکباریٔ تا کجا پیش سحاب
ایکؔ دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدۂ ترِ ہو سو ہو

اگر مقابلے میں کوئی بڑی طاقت ہے تو اس کے لیے خود کو بھی پوری کوشش کر کے دکھانی چاہئے۔ ہم خواہ مخواہ اپنے مقابل کو اپنے آپ سے زیادہ طاقتور سمجھتے رہتے ہیں اور یوں اس کے مقابلے کے لیے اپنی پوری توانائی بروئے کار نہیں لاتے۔ حالانکہ مقابلے میں طاقت سے زیادہ حکمت عملی کی ضرورت ہوتی ہے۔ طاقت کے بغیر حکمت عملی تو پھر بھی اپنا کام دکھا سکتی ہے حکمت عملی کے بغیر بڑی سے بڑی طاقت کے شکست کھانے کے امکانات موجود رہتے ہیں۔تو شعر زیر بحث میں میر صاحب یہی ترغیب دلا رہے ہیں کہ جب مقابلے میں آ ہی گئے ہیں تو اب سوچ سمجھ کر بھرپور حملے کی تیاری کیوں نہیں کرنی چاہئے۔ دوسرے مصرع میں ایک دن کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ تیاری کے لیے وقت لینا کوئی بات نہیں بُری بات تو دشمن کے سامنے آ کر حملہ نہ کرنا ہے۔

''ایک دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدۂ تر ہو سو ہو''

رونے کی ممانعت

کھل کر رونا میر صاحب کی حکمت عملی ہے نہ یہ کوئی حربہ ہے اور نہ کسی قسم کا گریز...... اس لیے رونا میر صاحب کا کوئی دلچسپ مشغلہ بھی نہیں کہا جاسکتا جیسا کہ شدت گریہ کی بدولت ان کے اشعار سے بعض اوقات محسوس ہونے لگتا ہے۔ کھل کر رونا تو میر صاحب کی ایسی حکمت عملی ہے جس میں ان کا خلوص ہمیں اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور اسی خلوص کی وجہ سے ان کی یہی حکمت عملی کوئی راز بھی نہیں۔ وہ تو بار بار ڈٹ کر طرح طرح سے اپنے اشعار میں اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ رونا کوئی معمولی بات نہیں اور کھل کر رونا تو بالکل بھی معمولی بات نہیں کہی جاسکتی۔ یہ تو ظلم وستم کے خلاف سب سے بڑا اور موثر ترین جہاد ہے۔ ہاں میر صاحب ایسے رونے کو ایسے گریہ کو قطعی پسند نہیں کرتے جس میں خود غرضی کا یا تنگ نظری کا کوئی شائبہ بھی نظر آتا ہے۔ ایسی صورت میں تو وہ للکار کر کہتے ہیں۔

زیرِ فلک بھلا تو رو دے ہے آپ کو میرؔ
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہوگیا ہے

دیدۂ و دِل کے درمیان سمندر

شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ جب تک آدمی روتا نہیں جی ہاں شعور اور دردمندی کے ساتھ روتا نہیں اس وقت تک اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی آنکھ کیا دیکھ رہی ہے اور اس کا دل کیا چاہتا ہے۔ یوں تو دیدۂ و دِل میں فاصلہ رونے کے باوجود بھی قائم رہتا ہے۔ لیکن اس فاصلے کا عرفان بذاتِ خود ایک بہت بڑی معرفت کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ مزید کچھ کہنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ آپ کو میرؔ صاحب کا وہ شعر سنا

دوں جس کے پیش نظر میں نے یہ گفتگو شروع کی ہے۔

کیا جانوں چشم تر سے اُدھر دل پہ کیا ہوا
کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی

دیدۂ و دِل کے درمیان سمندر ہمارے رونے کی وجہ سے حائل ہوا۔ اگر نہ روتے اور پوری طرح کھل کر نہ روتے تو یہ سمندر کیسے معرض وجود میں آ سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ اگر نہ روتے تو کوئی بہت بڑا لق و دق صحرا درمیان میں پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ عام طور پر جغرافیہ دان یہی کہتے ہیں کہ جہاں صحرا نہیں ہوتا وہاں سمندر ہوتا ہے اور جہاں صحرا ہے وہاں کبھی سمندر تھا۔

بہرحال جہاں تک میر صاحب کے زیر بحث شعر کا تعلق ہے اسے پڑھ کر تو فوراً جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے رونے نے دیدۂ و دِل کے درمیان دوری پیدا کر دی ورنہ اس سے پہلے یہ دونوں اس طرح دور نہ تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رونے سے اور کچھ ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو اتنا ضرور ہو جاتا ہے کہ آنسوؤں کی چھلنی میں سے جذبات بڑی حد تک پوری طرح چھن کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے والی کھٹن منزل سے گذر جاتے ہیں اور آدمی اس طرح تفکر کے تخت پر براجمان ہو جاتا ہے جس کو نفسیات کے کم نظر لوگ کیتھارس کا نام دیکر خوش ہو لیتے ہیں.... گویا رونے سے آدمی کے مزاج میں ملائمت پیدا ہوتی ہے یا نہیں ہوتی اس کے بارے میں یہاں میں کچھ عرض نہیں کر سکتا اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ رونے سے اس کے لیے جو فکر کا عالم پیدا ہوتا ہے اس کے زور پر آدمی سنگین حقائق سے مقابلہ کرنے کے لیے خود کو ضرور مستعد اور تیار پاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں رونا آدمی کو کڑے سے کڑے عمل کے لیے تیار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یا پھر اس بات کو یوں کہہ لیجئے کہ آنسوؤں میں اتنی حدّت ہوتی ہے جو حقائق کی فولادی صلاحیت کو بڑی حد تک پگھلا سکتی ہے اور پگھلا دیتی ہے۔ یا آنسوؤں میں اتنا زور ہوتا ہے جس کے لیے حقائق کے پتھروں کو توڑنا کوئی بڑی بات نہیں رہتا۔

مگر یہ تمام باتیں کر کے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے میں میر صاحب کے شعر زیر بحث کی تفہیم کرنے کی نسبت اس کی شعریت کو نقصان پہنچا رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''کیا جانوں'' کہہ کر میر صاحب نے بھی دل کی طرف سے اپنی بے خبری کا اظہار کیا ہے لیکن اس بے خبری میں جو ایک درد سے بھری ہوئی کیفیت پائی جاتی ہے اس نے شعر کی غزلیت اور اس کی ادبی حیثیت کو پوری طرح سنبھالا ہوا ہے۔

''کیا جانوں چشم تر سے اُدھر دل پہ کیا ہوا''.......... رونے کو تو ہم روئے لیکن اس رونے سے دل پر جو کچھ گذرا ہم اس سے بے خبر ہو گئے۔ ہمارے اور دل کے درمیان آنسوؤں کا سمندر آ گیا جس نے ہمیں یہ کہنے کا بہانہ مہیا کر دیا کہ ''کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی''....... گویا آنسو بہا کر دماغ کے حوالے سے آدمی کچھ پاتا بھی ہے تو دل کے حوالے سے بہت کچھ گنواتا بھی ہے۔ اس اعتبار سے رونا کوئی آسان کام یا سستا سودا نہیں ہے۔ دراصل اس شعر کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم روتے وقت دل اور دماغ دونوں کا خیال رکھیں اور عموماً گریہ و زاری میں جس چیز سے آدمی غافل ہوتا ہے وہ یہی غریب دل ہے جو دماغ کی مدد کرنے کے لیے اس کی خبر رکھنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے مگر دماغ اسے جب موقع لگتا ہے فراموش کرنے سے باز نہیں آتا۔ حالانکہ دماغ کو یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ دل کو فراموش کر کے وہ اپنی ایک بہت بڑی طاقت سے محروم ہونے کے خطرے کے قریب آ جاتا ہے۔

گویا گریہ وزاری میں رونے والے کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اسے اپنے دل کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے اور دماغ کا بھی...... لیکن عموماً ہوتا یہ ہے کہ ان دونوں ذمہ داریوں کو سنبھالتے سنبھالتے وہ اِدھر کا رہتا ہے اور نہ ادھر کا۔ دل بھی ہاتھ سے نکل نکل جاتا ہے بلکہ وہ تو آنسوؤں کے پہلے ریلے ہی میں ہاتھ سے نکل جاتا ہے بقایا طوفان سے تنہا دماغ کب تک نبرد آزما رہ سکتا ہے ایک وقت آتا ہے اسے بھی اپنا ہوش نہیں رہتا۔ بس یوں سمجھئے اسی عالم میں گریے کی شدت رہتی ہے اور جب اس شدت میں کچھ کمی آتی ہے تب اسے پتا چلتا ہے وہ اپنے دل سے تو بالکل بے خبر ہو گیا تھا۔ ایک حیران

کن نکتہ یہاں یہ ہے کہ آنسوؤں میں جذبات پہلے بہہ جاتے ہیں اور پھر تو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں تنہا دماغ کو آنسوؤں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے میر صاحب فریاد کررہے ہیں۔ کیا جانوں چشم تر سے اُدھر دل پہ کیا ہوا۔

رونے کے تجربے کی شدت

جیسا کہ میں پہلے بھی بار بار کہہ چکا ہوں اور شاید آئندہ بھی کہوں کہ جس طرح اردو شاعری میں ہمارے میر صاحب رونے کے تجربے کی شدت سے اپنی زندگی میں بار بار گذرتے رہے ہیں یہ توفیق کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی لیکن یار لوگوں نے میر صاحب کو داد دینے کے بجائے الٹا یہی سمجھا کہ میر صاحب کے پاس رونے دھونے کے علاوہ کرنے کے لیے اور کچھ موجود نہیں جبکہ رونے کے تجربے سے میر صاحب جس ہمت حوصلے شجاعت اور جرأت سے گذرے ہیں اس سے ان کی پوری زندگی مالا مال ہے جس کا مطالعہ اگر ہم کریں تو خود ہماری زندگی کس قدر اس دولت شجاعت اور جوانمردی سے مالا مال ہوسکتی ہے اس کا اندازہ ہمیں ابھی تک نہیں ہوسکا۔ اس حوالے سے میر صاحب ابھی تک تن تنہا ہیں۔ ویسے چپکے چپکے رونا تو خیر بہت ہی بڑی بات ہے ابھی تو انسان کو چیخ چلا کر رونا بھی نہیں آیا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو جاتا اور انسان نرے جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ میر صاحب کی طرح جذبات کو ایک طاقت کے طور پر استعمال کر کے اپنے پورے زور سے چیخ چلا کر رونے کی عظمت کو محسوس کر لیتا تو آج اس کی تاریخ میں ظلم وستم کی یہ کثرت نہ پائی جاتی جیسی کہ ابھی تک موجود ہے۔ بہرحال میر صاحب بے دھڑک ہو کر روتے ہیں اور ٹھہر ٹھہر کر یا ستا کر نہیں روتے بلکہ مسلسل روتے ہیں۔ یہ کام کس قدر مشکل ہے اس کا کچھ اندازہ میر صاحب کے مندرجہ ذیل شعر سے لگایا جاسکتا ہے۔

کس طور آنسوؤں میں نہاتے ہیں غم کشاں
اس آب گرم میں تو نہ انگلی ڈبوئیے

اس شعر میں غم کشاں ''اور''انگلی'' کے الفاظ خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں۔
یہاں غم کشاں کا مطلب یہ ہے کہ آنسوؤں کے آب حیات میں نہانا کوئی معمولی یا آسان بات نہیں اس کے لیے زندگی کے آلام و مصائب کو مجتمع کر کے ان کے غم کو اپنی طرف کھینچ کر ہی لانا نہیں پڑتا اس غم کو اپنی ذات میں جذب بھی کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر ایک شخص کو سچے غم کش کا خطاب حاصل ہوتا ہے۔ رونا زندگی کے ظلم و ستم کے خلاف سب سے بڑا احتجاج ہے اور نہایت موثر بھی۔ مگر زیر بحث شعر میں میر صاحب عام ڈرپوک لوگوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ لوگو آنسوؤں کے ابلتے اور کھولتے ہوئے پانی میں نہانا تو بڑی بات ہے خلوص اور جوانمردی کے بغیر کوئی اس پانی میں اپنی انگلی بھی نہیں ڈبو سکتا۔ اور اسی لیے میر صاحب کہہ رہے ہیں میرا پرخلوص مشورہ یہی ہے کہ اگر آپ میں ہمت اور حوصلہ نہیں تو آنسوؤں کی حدّت کو انگلی کی نوک سے بھی محسوس کرنے کی بے وقوفی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔

قمری کی چشم گریاں

آنسوؤں کے ضمن میں اور سرسبزی و شادابی کے حوالے سے بڑے بڑے کام تو بقول میر ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن کچھ چھوٹے چھوٹے کام بھی ہوتے ہیں جن کے سر انجام دینے سے آنسوؤں کے جمالیاتی پہلو کا پتا چلتا ہے۔ کام تو اپنی اپنی ہمت کے مطابق ہی ہوتا ہے لیکن ہر کام میں ایک صورت جمال اپنی کارکردگی دکھانے میں مسلسل مصروف عمل رہتی ہے۔ اگر یہ تسلسل ٹوٹے یا اس کام میں ذرا رکاوٹ آ جائے تو ایک عجیب قسم کی ناکامی کا سا احساس ہوتا ہے جو اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے میر صاحب کا

ایک شعر سنیئے اور انہیں کے بقول سر بھی دُھنیئے۔

شاید کہ مند گئی ہے قمری کی چشمِ گریاں
کچھ ٹوٹ سا چلا ہے پانی چمن کے جو کا

یہاں ایک بہت ہی نازک سا اور خوبصورت سا سوال سر اٹھاتا ہے. جی ہاں ایک کلی یا ایک غنچے کی طرح کہ جب تک پانی چل رہا تھا کسی نے نوٹس نہیں لیا جیسے ہی ذرا پانی رکا تو معلوم ہوا کہ اس چمن کی سیرابی اور شادابی میں قمری کی چشم گریاں کا بھی ہاتھ تھا۔ میر صاحب نے آپ کو چشم تر کے بڑے بڑے ہاتھ تو دکھائے ہی ہیں لیکن دیکھ لیجئے وہ قمری کی چشم گریاں کو بھی نہیں بھولے..... بس میر صاحب اسی نہ بھولنے کی داد کے خواہاں ہیں۔

ایک گل کا حکم

اسی طرح بقول میر ایک گل کے ایک خوبصورت حکم کی تعمیل میں کاروبار گلشن کو فروغ ملتا رہتا ہے۔ اس طرح کے کام عمل میں آتے رہتے ہیں ان کے لیے کوئی شوروغل نہیں مچایا جاتا اور ان کاموں میں شوروغل کا نہ ہونا ہی ایک حسن بھی پیدا کرتا ہے اور ایک توانائی بھی جو زندگی کو سانس لینا سکھاتی ہے۔

سو بار ہم نے گل کے کہے پر چمن کے بیچ
بھر دی ہیں آب چشم سے راتوں کو کیاریاں

آنسوؤں کی سخاوت آنسوؤں کی دریا دلی کی ایک تصویر بلکہ ایک مرقع یہ بھی بنتا ہے ..... اور اس شعر میں بھی بہت سے ننھے منے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ میر صاحب نے "سو بار" کیوں کہا آخر یہ احسان جتانے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر "چمن کے بیچ" ہی کیوں اِدھر اُدھر چاروں طرف کیوں نہیں۔ اور سب سے بڑا سوال جی ہاں کھلتے ہوئے پھول یا طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طرح کہ "راتوں" کے بجائے روشن

دن میں یہ کار خیر کیوں نہیں انجام دیا گیا...... غالباً اس لیے کہ یہ کام بہت خاموش فضاء کے متقاضی ہوتے ہیں۔

رومال یا بادل کا ٹکڑا

قصہ دراصل یہ ہے کہ تشبیہ و استعارہ سے معنی آفرینی تو ہوتی ہی ہے اس سے بھی بڑا کام حسن کاری ہے۔ ویسے میں تو معنی آفرینی اور حسن کاری میں ذاتی طور پر کسی فرق کا قائل نہیں لیکن چونکہ ایک زمانے میں مغرب کی تقلید کے طور پر حسن کاری سے معنی آفرینی اور مقصدیت وغیرہ قسم کی سب چیزوں کو خارج کیا جارہا تھا۔ اس لیے جملہ معترضہ کے پیرائے میں یہ بات کہدی...... ہمارے بزرگ اور ہمارے میر صاحب ان تمام باتوں کو جانتے تھے جبھی تو ان باتوں کی جان کاری کا شور مچانے کے بجائے انہوں نے ان باتوں کو اپنی شاعری میں سمویا اور رچایا بسایا ہے۔ میر صاحب نے اپنے ایک شعر میں اپنے ایک شعر میں اپنے رومال کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔ ایک مختصر بحر میں اپنے رومال کے اختصار کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے یعنی رومال کے پھیلاؤ کی وجہ سے کہ بڑی بات کو کم سے کم لفظوں میں کہا جائے تو اس کی بڑائی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ چھوٹی بحروں کا سارا فلسفہ ہی یہ ہے بشرطیکہ غور سے کام لیا جائے۔ ہاں تو میر صاحب فرماتے ہیں۔

دیدۂ تر پہ شب رکھا تھا میر
لکۂ ابر ہے مرا رومال

ظاہر ہے جب دیدۂ تر پر رکھا جانے والا رومال ایک بادل کا ٹکڑا ہے تو جس دیدۂ تر پر یہ بادل کا ٹکڑا رکھا گیا یا رکھا جاتا ہے وہ یقیناً بادل سے کوئی بڑی چیز ہی ہوگی۔ تو یوں ہمارے میر صاحب انسان کے آنسوؤں کی اور ان سے متعلقات اشیاء کی عظمت کا احساس ہمیں دلاتے ہیں تاکہ ہمیں انسان کے رونے کی قدر و قیمت کا احساس ہو۔

عقیق کی ایک نئی قسم کی دریافت

میر صاحب کا کہنا ہے کہ آنسو ایسی کوئی کمزور یا معمولی چیز نہیں ہے کہ وہ پلک پر آیا اور وہاں سے ڈھلک کر رخسار پر سے ہوتے ہوئے رزق خاک ہو گیا۔ رزق خاک تو بڑی سے بڑی چیز اور مضبوط سے مضبوط چیز ہو جاتی ہے لہٰذا کسی چیز کا خاک میں مل جانا اس کے کمزور ہونے کی دلیل قطعی طور پر قرار نہیں پاتا۔ چنانچہ آنسو کے بارے میں میر صاحب فرماتے ہیں۔

اس رنگ سے چمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے مرا اشک عقیق جگری کا

آپ نے عقیق یمنی وغیرہ قسم کا تو ذکر سنا ہوگا یہ عقیق جگری خاص میر صاحب کی دریافت ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ بڑی سچی اور کھری یعنی مضبوط دریافت ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ بڑی سچی اور کھری یعنی مضبوط دریافت ہے...... آپ جانتے ہیں جگر کا تعلق انسان کی ہمت اور حوصلے سے ہے چنانچہ میر صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ رونا کوئی معمولی کام نہیں۔ یہ بڑے حوصلے اور ہمت کا کام ہے۔ آدمی روتا ہے تو ظلم وستم کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتا ہے۔ لہٰذا آنسو کو ایک مضبوط قسم کی چیز ہونی چاہیئے اور صد شکر کہ میرے آنسو ہیرے ہیں ہیرے بھی ایسی ویسی کان کے نہیں کان جگر کے۔

دل میر کی مختلف نشیلی کیفیات

اب میں آپ کو میر صاحب کے دل پرخوں کے بارے میں کچھ باتیں بتاؤں گا جی ہاں اس دل پرخوں کے بارے میں جس نے میر صاحب کو ہمیشہ ایک عجیب سرور و کیف کے عالم میں رکھا...... اور یہ باتیں میر صاحب کی خود ان کی زبانی ہوں گی یعنی ان کے اشعار کے حوالوں سے...... اور پھر آپ اندازہ لگائیے کہ میر صاحب کا انسانی دل کے بارے میں کیا تصور ہے اور اس تصور نے انسانی زندگی کے حقائق سے کس قدر رخم کے خم کشید کیے ہیں۔

ہنگامہ گرم کن

میر صاحب کے دیوانِ اوّل کی پہلی غزل کا حسن مطلع ملاحظہ فرمائیے۔

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

بے قرار اور بے صبر دل ہنگامہ برپا کر رہا تھا اور اس کے ہر نالے سے قیامت کا شور یعنی فیصلہ کن شور پیدا ہو رہا تھا۔ چونکہ یہ شعر دیوان اوّل کی پہلی غزل کا حسن مطلع ہے اور یوں بھی تمام غزل کا موڈ حمدیہ ہے اس لیے ہم اس حسن مطلع کو بھی حمدیہ شعر کہہ سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دل بے صبرا تو اس لیے ہے کہ قدرت نے اس کی کمزور اور عاجز ہستی کو ایک بہت بڑی ذمہ داری سونپ دی ہے اور وہ ذمہ داری ہے دنیا میں انصاف قائم رکھنا اور اگر کوئی بے انصافی ہو رہی ہو تو اس پر بہت جاندار قسم کا احتجاج کرنا۔ اور احتجاج کی یہ صورت ہو کہ اس دل کے ہر نالے سے ہر فریاد سے قیامت کا شور پیدا ہو۔ شور نشور یعنی فیصلہ کن شور کہ جو نا انصافی ہوئی ہے یا ہو رہی ہے اس کو فوراً دور کیا جائے اور فوری انصاف کی فضا قائم کی جائے۔ آپ کے ذہن میں ہوگا کہ غالب کے دیوان کا مطلع نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا بھی حمدیہ ہے لیکن دیکھ لیجئے دو اِن عظیم شاعروں کے شاعری میں اپنی اپنی عظمت موجود ہے۔ غالب کے مطلع میں امیجری دو حواس سے قائم ہوتی ہے باصرہ اور سامعہ سے جبکہ میر صاحب کے ہاں صرف سامعہ سے امیجری پیدا کی گئی ہے اور ابلاغ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ میر صاحب کی قدرت سے فریاد یہ ہے کہ مجھ ناتواں عاجز کو اگر عدل و انصاف کی فضاء قائم رکھنے کی ذمہ داری سونپی ہے تو میرے دل میں یہ توانائی بھی عطا کی جائے کہ اوّل تو دل اس فضاء کو قائم رکھے اور اگر کوئی دوسرا ظلم یا انصافی کرتا ہے تو اس کے خلاف ایسا زوردار احتجاج کرنے کی اس دل میں توانائی پیدا ہو جائے کہ ظالم اس احتجاج سے مرعوب ہو کر ظلم و ستم سے ہاتھ اٹھا لے۔ شعر زیر بحث کی ردیف تھا ہمیں روز ازل کی طرف متوجہ کر رہی ہے اور اسی وجہ سے اس شعر کے حمدیہ ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

دل کی آتش بلند

میر صاحب کے دیوانِ اوّل کی پہلی غزل ہی میں سے میں اب ایک دوسرا

شعر پیش کر رہا ہوں۔

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

اس شعر کے مطالعہ سے پہلی بات جو قاری کے ذہن پر واضح ہوتی ہے یہی کہ انسان کو قدرت نے جو دل دیا ہے اس میں طاقت اور توانائی بھی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ اب یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ اس طاقت اور توانائی سے کام نہ لیا جائے چنانچہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ جنہیں کوہِ طور پر خدا کے نور کی تجلی نظر آئی تھی اس سے یعنی حضرت موسیٰ کلیم اللہ سے مخاطب ہو کر شاعر کہہ رہا ہے اے موسیٰ اے کلیم اللہ آپ کو کوہ طور پر خدا کا جلوہ نظر آیا تھا اور اس جلوے کی گرمی نے کوہ طور کو پھونک کر رکھ دیا تھا تو اس طرح کے جلوؤں کی حرارت سے میرا دل بھی بھرا پڑا ہے لیکن میں نے اپنی کوتاہیوں کے باعث اپنے دل کی آتش کو اتنا بلند ہی نہیں کیا کہ وہ کوہ طور کا واقعہ دہرا سکتا یا اسی طرح کا کوئی اور واقعہ ظہور میں لاسکتا۔ بلکہ میرے دل میں تو ایسی آگ بھری پڑی ہے جس کا ایک شعلہ کوہِ طور ایسے سو پہاڑوں کو جلا کر خاک کرسکتا ہے۔ دیکھ لیجئے میر صاحب انسانی دل کو کس قدر توانا اور قوی قرار دیتے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ محض اُن کی شاعری نہیں ہے۔ اُنہوں نے تو زندگی بھر درد والم کے نجانے کتنے پہاڑوں کو اپنے اِس دل کی آگ سے راکھ کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے درد والم کے ان پہاڑوں کی راکھ چھوڑنے کی بات اس لیے کی ہے کہ میر صاحب کے دل کی کرامات یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ یعنی میر صاحب کا دل اس راکھ اور اس خاک کو اکسیر بنانے کی سعادت سے بھی فیض یاب تھا۔

ہیں مُشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

اور سچ پوچھئے تو میر صاحب کے دل کے ساتھ جو میں نے تھا کا لفظ لگا کر اسے ماضی سے متعلق کر دیا ایسا نہیں میر صاحب کا دل یعنی انسان کا دل تو آج بھی اسی طرح

مضبوط اور صاحب کرامات ہے بس اسے ذرا ہماری توجہ درکار ہے۔

دل کی طاقت و توانائی

میر صاحب کی غزل کو پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے آدمی کا دل ہی وہ قوت اعلیٰ ہے جس کے لیے ہر طرح کا انقلاب برپا کرنا پلک جھپکنے کا سا معاملہ ہے۔ لیکن یہ پلک جھپکنے کا عرصہ عام پلک جھپکنے کا عرصہ تو خیر ہے ہی مگر بات اس سے بہت کچھ آگے کی بھی ہے۔ پلک جھپکنے میں جو بہت سے عوامل مصروف کار ہوتے ہیں ہم انہیں بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اور فراموش نہ کرنے کا مطالب ان عوامل کی گنتی یا شمار کرنا بھی نہیں بس ان کے احساس کو سامنے رکھنا ہے۔ میر صاحب کا ایک مشہور شعر ہے۔

ماہیت دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرہ خون یہ دل طوفان ہے ہمارا

ویسے دیکھنے میں دل ایک قطرہ خون سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن اس قطرے میں کتنے طوفان بھرے ہیں۔ یہ اسی وقت پتا چلتا ہے جب اس قطرے سے عمل کے بے شمار دریا نکلنے شروع ہوتے ہیں۔ گویا انسان کا دل ہے بے شمار اعمال کے بے شمار دریاؤں کا دہانہ...... اعمال کی اس تمام گہما گہمی کے باوجود جو چیز دل کے ضمن میں قابل غور ہے وہ ہے Monotony یکسانیت کو توڑنے اور زندگی کو تازگی سے لبریز کر دینے کی قوت۔ لہٰذا انسان کا دل جب ذرا بوریت محسوس کرنے لگتا ہے تو دین اور دنیا دونوں کی ماہیت کو اِدھر سے اُدھر کر کے رکھ دیتا ہے۔ دینا اور عقبیٰ دونوں ہی بڑی چیزیں ہیں لیکن انسان کے دل سے بڑی نہیں۔ جس میں حقیقت عظمیٰ کا اکثر گذر رہتا ہے یا حقیقت عظمیٰ کی اگر کوئی مادی اور روحانی سطح پر گذرگاہ ہو سکتی ہے تو وہ انسان کا دل ہی ہے۔

شعر زیر بحث میں میر صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دُنیا اور عقبیٰ کو سنبھالنے والی

چیز انسان کا دل ہے اگر انسان اپنے دل کا خیال رکھے تو وہ ان دونوں عالموں کو اپنے اپنے مقام پر رکھ سکتا ہے۔ دونوں عالموں سے ان دونوں عالموں کی ماہیت کے اعتبار سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اگر دل پر قابو نہیں تو یہ دونوں عالم اپنی اپنی ماہیت کو صحیح معنی میں بروئے کار نہیں لا سکتے یا ان دونوں کی ماہیت اپنی اپنی جگہ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ماہیت دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے کا مطلب یہ ہے کہ ماہیت دو عالم یعنی دین اور دنیا کی ماہیت کوئی بے جان اور بے حرکت چیز نہیں ہے۔ اس میں کسی وقت بھی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اس کا انحصار انسان کے دل پر ہے۔ کہ اس میں کتنا زور ہے...... دیکھنے میں دل کو ایک قطرۂ خون کے ساتھ آسانی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے لیکن اپنی قوت کے اعتبار سے یہ ایک سو طوفانوں کا ایک طوفان ہے۔

طرفہ سنگستان......دل

دیکھ لیجئے میر صاحب نے اپنے ایک شعر میں دل کو طرفہ سنگستان کہا ہے یعنی عجیب پتھروں سے بھرا ہوا گھر......گویا سخت و نرم یا نار و نور کے جملہ عبارات اپنی جگہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کی حیثیت متعین کرنے والا بھی انسان کا دل ہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک سچے اور پکے دل میں صرف خون ہی بھرا ہوا نہیں ہوتا اس کی جگہ یعنی خون کی جگہ پتھر بھی آ سکتے ہیں یا بھرے جا سکتے ہیں۔ یا دل کی مرضی ہے وہ اپنے خون ہی کو پتھر بنا سکتا ہے۔ اور پھر جب دل میں پتھر جمع ہو جاتے ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ دل کی تمام تر ملائمتیں اس سے چھین لی گئی ہیں۔ پتھروں میں اپنے انداز کی نرمی بھی ہوتی ہے اور نار و نور کا امتزاج بھی۔ میر صاحب کا وہ شعر یہ ہے جس کی روشنی میں یہ باتیں کر رہا ہوں۔

طرفہ آتش خیز سنگستان ہے دل
مقتبس یاں سے ہے شعلہ طور کا

یہ لیجئے وہ جو کوہ طور پر برق چمکی تھی اس کو بھی دراصل حضرت موسیٰ نے اپنے دل کی حرارت سے ساری چمک دمک بخشی تھی چمک نے کوہِ طور کو سرمہ بنا کر رکھ دیا اور حضرت موسیٰ الگ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ گویا دل میں خون بھرا ہو یا پتھر ان دونوں کا نتیجہ ہمیشہ کوئی عمدہ قسم ہی کا نکلتا ہے۔ موسیٰ بے ہوش نہیں ہوئے تھے انہیں ایک نیا ہوش عطا کیا گیا تھا۔ ہر نئے ہوش کے آنے پر پہلا ہوش بے ہوشی کی منزل سے دو چار تو یقیناً ہوتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے۔ کہ ماضی کو بے ہوشی کی صورت دینا تاریخ کو صحیح تناظر میں دیکھنے کے مترادف ہے۔ ورنہ آج تک جو انسان تاریخ کو ہوشمندی کا درجہ دیتا رہا ہے اس نے انسان کا جو حال بنا ڈالا ہے وہ بھی کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہونا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ تاریخ میں جو غلط یا صحیح وقوع میں آیا اس کا نہ صرف پتا لگایا جائے بلکہ اسے تسلیم بھی کیا جائے۔ تو یوں میر صاحب کے زیر بحث شعر کی روشنی میں بات یہاں پہنچتی ہے کہ دل کے پتھر سے بھی جو چنگاری پھوٹتی ہے وہ علم و عرفان کی ایک صبح لے کر آتی ہے۔ پھر دل پر خون کی اک گلابی سے جو میر صاحب عمر بھر شرابی سے رہے اس کی صداقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ دل پر خون کی گلابی کا نشہ دل میں سے اگر خون نکل جائے پھر بھی باقی رہتا ہے۔ اور یہی نشہ دوبارہ دل کو خون سے بھر لینے کا موجب بھی بن جاتا ہے۔

مینا میں سنگ ریزے

دل اگر سنگستان یعنی پتھروں کا گھر نہیں بھی ہوتا تو بھی کبھی آدمی اِدھر اُدھر سے پتھر اٹھا کر بھی اس میں ڈالنے سے باز نہیں آتا۔ کہ ایک زندہ آدمی یہ گوارا ہی نہیں کر سکتا کہ اس کا دل کسی وقت بھی خالی رہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں میر صاحب کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

شراب خون بن ، تڑپوں سے دل لبریز رہتا ہے
بھرے ہیں سنگ ریزے میں نے اس مینائے خالی میں

میر صاحب کے اس شعر کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تڑپنے کے لیے جی ہاں دل کے تڑپنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس میں خون ہو تبھی دل تڑپتا ہے۔ دل خون یعنی اپنی عام طاقت کے نہ ہوتے ہوئے بھی تڑپنے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ تڑپنا اس کی فطرت میں ہے۔ البتہ خون کے بغیر دل کی تڑپوں میں سے شراب تو نہیں نکلتی سنگ ریزے ضرور پیدا ہوتے ہیں اور یوں میر صاحب اپنے مینائے دل میں سنگ ریزے ڈال لیتے ہیں اور تصور کرتے ہیں کہ اگر اور کچھ نہیں اس وقت میرا دل خالی تو نہیں ہے کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میناء دل خالی لیے پھرتے ہو۔ اور مینائے دل میں چاہے سنگ ریزے پڑے ہوں اس میں اتنی طاقت ہمیشہ باقی رہتی ہے کہ وہ ان سنگریزوں سے طرح طرح کے نشے کشید کر سکے۔ اصل میں میر صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نشے کا تعلق صرف شراب سے نہیں اگر دل ہمارا ساتھ دے تو پھر نشہ کائنات کی ایک ایک چیز سے پھوٹ پھوٹ کر خود بخود جسم و جان میں داخل ہو کر اپنے جلوے دکھاتا ہے اور اسی تصور کی توانائی کے تحت میر صاحب نے اپنے رنج و غم اور طرح طرح کے مصائب سے نشے کشید کیے اور زندگی کو نئے نئے ابعاد ڈائمنشن **Dimanrian** سے روشناس کرایا۔

دل کی ویرانی اور شکستگی

بعض اوقات کسی انسان کے دکھ درد کو سمجھنا یا کم از کم اس کا احساس کرنا تو پھر بھی آسان کام ہوتا ہے لیکن اس کے یعنی انسان کے حوصلے اور ہمتوں کو سمجھنا خاصا مشکل کام ہے۔ کہ دکھ درد کی صورتیں عام طور پر جانی پہنچانی ہوتی ہیں ان میں عموماً نیا پن بہت کم ہوتا ہے مگر انسان کا حوصلہ اور ہمتیں اکثر نئی نئی صورتوں سے جلوہ گر ہوتی ہیں

تو یوں پتا نہیں چلتا کہ اس وقت آدمی دکھ میں مبتلا ہے یا ہمت اور حوصلے سے کام لے رہا ہے۔

ہمارے میر صاحب کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہے۔ انہوں نے جس طرح دکھ درد سہے اور غم اٹھائے ان سے کہیں زیادہ انہوں نے حوصلے اور ہمت سے کام لیا۔ لہٰذا لوگوں نے میر صاحب کے دکھ درد کو تو دیکھا مگر انہیں میر صاحب نے جس طرح برداشت کیا اس پر لوگوں کی توجہ نہیں ہوئی غلطی دیکھنے والوں کی تھی اور بدنام ہوئے بے چارے میر صاحب بطور حزن و یاس کے شاعر یا درد والم کے شاعر۔ اب ان کا یہ مشہور شعر لے لیجئے۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

اس شعر کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس میں میر صاحب دل کی ویرانی کا رونا رو رہے ہیں ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے میر صاحب تو اس کے برعکس بات کہہ رہے ہیں بلکہ وہ تو واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ بھائی یہ دل کی ویرانی کا ذکر کیا لے بیٹھے ہو یہ تو اس کے ساتھ عام ہوتا رہتا ہے۔ ہمارا دل چونکہ ہمیشہ طرح طرح کی ثروتوں سے لبریز رہتا ہے اس لیے لوگ اس کو لوٹ کر ویران نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے۔ دل کی ویرانی کا ذکر کرنے کے بجائے داد اس بات کی دو کہ دل ابھی ویران ہوتا ہے کہ وہ پھر اپنی ہمت سے زندگی کی نو بہ نو دولت وصولت سے شاد آباد ہو جاتا ہے۔ شادابی کی صورت میں بھی لوگ دل کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے جیسا کہ انہیں کرنا چاہئے۔ وہاں بھی لوگ اپنے فائدے کی سوچتے ہیں۔ چلیئے اپنے فائدے کی سوچنا بھی کوئی بری بات نہیں لوگ تو اپنے فائدے کے ساتھ دوسروں کے نقصان کے درپے جو ہو جاتے ہیں اس پر حیرت ہوتی ہے۔ مگر دل پھر بھی لوگوں کے اس رویے سے کبھی کبھی تو جان بوجھ کر دھوکا کھا جاتا ہے ورنہ غریب دھوکا تو کھاتا ہی رہتا ہے جس کے نتیجے میں وہ پھر لٹ جاتا ہے۔ اس لیے میر صاحب فرما رہے ہیں دل کی ویرانی کا کیا

مذکور ہے۔

ہاں ویرانی کے بعد دل سے متعلق دوسری بات اس کی شکستگی ہے۔ یہاں پھر شکستگی کی دوصورتیں ہیں ایک تو دل خود کسی سے ٹکرا کر شکستہ ہو دوسرے کوئی اور دل سے ٹکرا کر اسے شکستہ کرے۔ پہلی صورت کا امکان بہت کم ہے کیونکہ دل تو ایسی چیز ہے جو خوشی کے مارے اپنی ہی جگہ پر اچھلتا رہتا ہے اسے دوسروں سے ٹکرانے کی فرصت کہاں۔ لہٰذا دوسری صورت ہی کا امکان باقی رہ جاتا ہے یعنی کوئی دل سے ٹکرا کر اسے چکنا چور کرے یا چکنا چور کرنے کی مسلسل کوشش میں مصروف ہو جائے اس صورت حال کا اظہار میر صاحب نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے۔

دل سے میرے شکستیں، الجھی ہیں
سنگ باراں ہے آبگینے پر

اس شعر سے تو یہی جھلک رہا ہے کہ دل Unbrokable material نہ ٹوٹنے والے شیشہ سے بنا ہوا ہے۔ اور سچی بات تو یہ کہ چھوٹے موٹے حملے سے تو دل ٹوٹتا بھی نہیں ہے۔ کم از کم دل کے بارے میں میر صاحب کا نظریہ بہت ہی مضبوط قسم کا ہے۔ مگر کوئی چیز اس دنیا میں کتنی بھی مضبوط ہو اس کے ٹوٹنے کے امکان سے انکار تو نہیں کیا جاسکتا۔ اور پھر ٹوٹتا بھی دل کا ٹوٹنا۔ چونکہ یہ کوئی معمولی بات نہیں اِس لیے میر صاحب نے اس غیر معمولی بات کا اظہار بھی کس خوبصورتی سے کیا ہے۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نہ ڈھائی ہے

گویا جس طرح دل کا اپنی جگہ قائم رہنا قابل دید امر ہے اسی طرح اس کا ٹوٹنا اس سے بھی کہیں زیادہ قابل دید منظر پیش کرتا ہے اور آپ جانتے ہیں کوئی بھی قابل دید منظر اتنا تو تقاضا ضرور کرتا ہے کہ اسے ایک بار ہی دیکھ کر خاموش نہ ہو جایا جائے اس شعر سے میر صاحب کا مقصد کوئی سبق حاصل کرنا ہرگز نہیں۔ وہ تو انسانی قلب کی عظمت کو آپ پر واضح کرنے چاہتے ہیں کہ اگر دل ٹوٹتا بھی ہے تو اس کا ٹوٹنا بھی

ایک شان رکھتا ہے۔ صحیح و سالم رہ کر تو خیر دل آپ کو زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنا سکھاتا ہی ہے لیکن دل ٹوٹتا ہے تو پھر بھی انسان کے دیکھنے کے لیے بہت کچھ چھوڑ جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میر صاحب کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ آپ صرف اپنے دل کی شکستگی ہی کو دیکھتے رہ جائیں وہ تو بین السطور آپ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اتنی بڑی عمارت کی دوبارہ تعمیر شروع کر دیجئے اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ بقول حسن عسکری ''میر کے ہاں شکست تو ہے شکست خوردگی نہیں۔''

شکست کے بارے میں غالب کا نظریہ تو خیر بہت واضح ہے جیسا کہ وہ اپنے اس شعر میں کہہ رہا ہے۔

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہر شکست
نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

لیکن میر صاحب کا نظریۂ شکست بھی کوئی اتنا ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ میر صاحب اپنے شعر زیرِ بحث میں یہی تو کہہ رہے ہیں کہ اگر دل کی عمارت بہت بڑی تھی جس کو غموں نے ڈھا دیا تو یہ غم بھی تو کوئی چھوٹے نہیں جنہوں نے اتنی بڑی عمارت کو ڈھا کر رکھ دیا۔ لیکن اس کے باوجود غم پھر بھی دل سے بڑے نہیں۔ یہی تو میر صاحب کا شعر ہم پر واضح کرنا چاہتا ہے۔

اصل نشہ

نشہ اصل میں ہے کیا چیز؟ اوّل تو یہ سوال بذاتِ خود دلچسپ ہے لیکن میر صاحب کے کلام کی روشنی میں تو اس سوال کی دلچسپی اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اپنے تمام درد و الم کے باوجود ان پر پوری زندگی ایک نشہ کی کیفیت چھائی رہی۔ میر صاحب نے اس کا اظہار بھی کیا جس سے ہمیں پتا چلا کہ نشہ اصل میں حقائق حیات سے گریز کا نام نہیں ہے۔ اسکے برعکس نشہ تو حقائق حیات کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونا اوران کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا نام ہے۔ چنانچہ میر صاحب نے اپنے ایک شعر میں تو واضح طور پر اس بات کا اعلان کر دیا۔

ہم مست بھی ہو دیکھا آخر مزا نہیں ہے
ہشیاری کے برابر کوئی نشا نہیں ہے

میر صاحب کے اس شعر سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی کا سارا کیف و سرور ہوشمندی کے ساتھ سانس لینے میں ہے۔ مگر اسی شعر میں میر صاحب نے کمال سادگی کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی کہ ہشیاری میں نشہ کے جملہ درجات شامل ہیں۔ جیسے جیسے آپ کی ہوشمندی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے آپ کا نشہ بھی تیز ہوتا جاتا ہے۔ اس کے درجات بھی بلند ہو جاتے ہیں پہلے مصرع کے لفظ مزا سے بات نیچے سے شروع ہوتی ہے اور دوسرے مصرع میں لفظ ''برابر'' نے ہشیاری اور نشہ کو ایک صف میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ گویا ہشیاری اگر نشہ ہے تو نشہ بھی ہشیاری کا دوسرا نام قرار پاتا ہے وہ جو میر صاحب نے فرمایا ہے ''عمر بھر ہم رہے شرابی سے'' تو کوئی ویسے ہی نہیں کہدیا بڑے سوچ سمجھ کر ایک بہت ہی پیاری بات کہی ہے جو زندگی کے

درد و آلام کا نہایت سلیقے اور قرینے سے قلب ماہیت کرتی جاتی ہے۔ اور خوشیوں کے اجالے ہیں کہ ہمارے چاروں طرف پھیلتے جاتے ہیں۔

ہشیاری کے نشے کی تیزی بھی بہت ہی نرالی قسم کی ہے کہ ہشیاری کا نشہ جس قدر تیز ہوتا ہے آدمی کے دل کی آنکھیں اُسی مناسبت سے زیادہ کھلتی جاتی ہیں۔ ہشیاری کی مدہوشی کمال کی دیدہ وری کا درجہ رکھتی ہے۔

خیال شراب اور آئینہ

ایک عجیب لطف کی بات یہ ہے کہ میر صاحب کے ہاں شراب اور اس کے جملہ نشوں کے ساتھ کسی قسم کی دھند یا غیر واضح فضاء کا تصور نہیں ہے۔ شراب ہے تو آئینے کی طرح اس کا خیال ہے تو ایک شادابی کے ساتھ پورے ماحول میں آب حیات کے ساغر چھلک رہے ہیں۔ ان کا ایک شعر سنئے۔

دل میں بھرا زبسکہ خیال شراب تھا
مانند آئینے کے مرے گھر میں آب تھا

سوچنے کی بات ہے آئینے کے ساتھ پانی کا ایک تعلق تو ہے لیکن اس قدر شفافیت کے ساتھ نہیں جیسا کہ اس شعر میں پورے گھر میں آئینے کی طرح متخیلہ کی بدولت پانی اپنے جلوے دکھارہا ہے۔ اصل میں وہی بات کہ میر صاحب کے ذہن میں جو حقائق حیات کو ان کی ہزار سنگینی کے باوجود چمکا دمکا کر رکھنا اور ان پر اپنے تصرف کو ہاتھ سے جانے نہ دینا ایک عزم کے ساتھ تمام آلام و مصائب کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو سینہ سپر رکھنا یہ تمام باتیں ہیں جو میر صاحب کے خیال شراب کو بھی اس قدر نتھار کر ہمارے سامنے لائی ہیں کہ ہم دم بخود ہو کر ایک حیرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں ہمارے میر صاحب بھی کیا قیامت کے آدمی تھے اور حقائق حیات کے ساتھ بڑی طرح داری کے ساتھ نبرد آزما ہونے والی شخصیت۔

آنسو اور شراب

کہتے ہیں اگر کسی درد و غم کا خیال بھی آ جائے تو آدمی شراب پی کر روتا ہے لیکن میر صاحب کے ہاں شراب پی کر رونے کا مسئلہ کچھ اور ہے۔ وہ کہتے ہیں آدمی پہلے اپنے درد و الم سے شراب کشید کرے ور پھر اسے اپنے آنسوؤں کی گرمی دے کر دو آتشنہ بنائے اور پھر دیکھے زندگی اسے کس انداز کی توانائی عطا کرتی ہے۔ میر صاحب کا ایک شعر ہے۔

تمام روز جو کل میں پیے شراب پھرا
بسانِ جام لیے دیدۂ پر آب پھرا

دراصل میر صاحب اپنے عام قاری کو بھی شراب اور آنسوؤں کے اس امتزاج سے بہرہ ور کرنا چاہتے ہیں۔

جب آدمی دیدۂ پُر آب کو جامِ شراب کی طرح لیے پھرتا ہے تو پھر اُس وقت آنسو اُس کے لیے طاقت بن جاتے ہیں۔ یا اِس بات کو میر صاحب کی زبان میں اِس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جب بھی آدمی کو زندگی کی اشیاء ایک نشیلی کیفیت عطا کرتی ہیں تو اُس کی آنکھوں میں خود بخود آنسو آ جاتے ہیں تشکر کے احساس سے بھی اور اپنے تغافل کے خیال سے بھی کہ زندگی نے اُسے کیا کیا کچھ عطا کیا لیکن وہ اُس کا شکریہ ادا نہ کر سکا۔

دو گردشیں

ہماری اس دنیا میں بقول میر صاحب دو ہی تو گردشیں ہیں ایک گردش ایام اور دوسری گردش ساغر پہلی گردش یعنی گردش ایام ہمیں حرکت میں رکھتی ہے اور دوسری گردش یعنی گردش ساغر، یہ ہمیں قدرے ستانے اور تازہ دم کرنے کے لیے ذرا رکنے یا ٹھہرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ میر صاحب ہی کا شعر ہے۔

ایک دو چشمک اِدھر گردشِ ساغر کہ مدام
سر چڑھی رہتی ہے یہ گردشِ ایام بہت

اس شعر میں میر صاحب فرماتے ہیں کہ گردش ایام ہمیشہ ہمارے سر پر سوار رہتی ہے یا گردش ایام کا نشہ ہمیں کچھ زیادہ ہی خراب و خستہ کرتا ہے اس لیے گردش ایام کا زور توڑنے کا ایک ہی حل ہے کہ گردش ساغر سے لطف اندوز ہوا جائے کیونکہ دنیا میں جہاں آدمی ہر وقت گردش میں رہتا ہے وہاں اسے تازہ دم ہونے کے مواقع بھی میسر آتے ہیں اسے ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہئے۔ لیکن میر صاحب کی عالی ہمتی انہیں گردش ساغر کو ایک دو چشمک سے زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ نشہ اصل میں گردش ایام ہی کا کوئی معنی رکھتا ہے گردش ساغر تو محض اس کے غرور کو نیچا دکھانے کے لیے کام میں آنی چاہئے۔ اس لیے میر صاحب نے گردشِ ساغر سے ''ایک دو چشمک'' سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ اور یہی وہ احتیاط ہے جس نے میر صاحب کو ہمیشہ درد و آلام سے دست و گریبان ہونے کی اور انہیں نیچا دکھانے کی نہیں بلکہ انہیں یعنی درد و آلام کو ایک طاقت کے طور پر استعمال کرنے کی تدبیر بخشی اصل میں انسان کی احتیاط بھی حالات کے

ضمن میں ایک ایسی مضبوط گرفت کا کام کرتی ہے جس سے آدمی اکثر بہت سے کمزوریوں سے بچ جاتا ہے اور اس کے بدلے میں اسے نو بہ نو قسم کی توانائیاں حاصل ہوتی ہیں......لیکن احتیاط کسی خوف یا اندیشے کا نام نہیں یہ تو خوف اور اندیشے کو بھی اپنے قابو میں رکھنے کی ایک خوبصورت صورتِ حال کو تخلیق کرنے کا ہنر ہے۔ اور میر صاحب نے اپنی شاعری میں اس ہنر کو اتنی فن کاری سے استعمال کیا ہے کہ اکثر اوقات قاری کو اس کا پتا نہیں چلتا۔ وہ میر صاحب کی احتیاط کو بھی ایک جرأت اور ایک حوصلہ سمجھتا ہے یا حوصلہ و ہمت کا اظہار۔

گویا میر صاحب کے ہاں احتیاط اور حوصلے کے اِس امتزاج کو جلدی سے سمجھ لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ قاری کو اِس ضمن میں خاصا ہشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ قاری جس قدر ہشیار اور چوکس ہوگا اُسی قدر میر صاحب کے کلام سے مستفید ہونے کی سعادت حاصل کر سکے گا۔ اصل میں میر صاحب کی زبان کا سادہ ہونا قاری کو اکثر دھوکے میں رکھتا ہے۔ لیکن یہ دھوکا قاری کی اپنی ذات سے اُبھرتا ہے میر صاحب اپنے قاری کو دھوکا نہیں دیتے۔ گویا ذرا سی عدم توجہی اور غفلت بھی انسان کو دھوکے میں ڈالنے کا موجب بن جاتی ہے۔

میر صاحب کے ہاں عیش کا مفہوم

جب لوگوں کو اور خصوصیت کے ساتھ ہمارے اہل قلم اور شعرا حضرات کو عیش میسر نہیں آتا تو اس کا مذاق یا تمسخر اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ میر صاحب کے خیال میں اوّل تو عام مفہوم میں عیش کا میسر آنا ایسی کوئی قابل تعریف بات نہیں دوم عیش کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کچھ عرصے کے لیے بھی حاصل ہو جائے تو بڑی بات ہے عیش تو بقول میر صاحب زندگی میں آدمی کو مسلسل میسر آنی چاہئے اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں...... حصول عیش کا سارا دارومدار انسان کے حوصلے اور ہمت پر ہے۔ جیسی جیسی کوئی ہمت دکھاتا ہے ایسی ایسی اس کو عیش میسر آتی رہتی ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ صحیح سمت میں مسلسل تگ و دو جاری رہے تو آدمی کو عیش بھی مسلسل حاصل ہوتی رہتی ہے۔ پھر وہی بات کہ اوّل تو صحیح سمت میں مسلسل تگ و دو کا جاری رہنا ہی بذات خود ایک ایسا عمل ہے جو اس کو عیش رواں دواں سے آشنا کرتا رہتا ہے۔ اس ضمن میں میر صاحب کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے۔

جہاں کے باغ کا یہ عیش ہے کہ گل کے رنگ
ہمارے جام میں لوہو ہے سب، شراب نہیں

مطلب یہ ہے کہ کوئی اپنی کم ہمتی کے باعث اس حقیقت کو تسلیم نہ کرے تو دوسری بات ہے ورنہ اس دنیا کے باغ میں اصل عیش یہی ہے کہ گلاب کے رنگ میں آپ کے جامِ دل میں لہو موجود رہے تو پھر کسی زمانہ ساز شراب کی ضرورت نہیں...... خون بذاتِ خود ایک ایسی شراب ہے جو آدمی کو زندگی کے بھرپور نشوں سے ہر وقت

ہمکنار کرتا رہتا ہے• بشرطیکہ کوئی اپنے اس خون کی اپنی اس زندگی کی اور اپنی اس زندگی کے حوصلوں اور ہمتوں کی قدر کرنا جانتا ہے اور ان حوصلوں اور ہمتوں کو اپنے عرصۂ حیات میں بروئے کار لانے کا پورا پورا یقین رکھتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں میر صاحب کا یہی وہ اچھوتا مفہوم عیش ہے جس نے ہزار درد و آلام کے باوصف میر صاحب کو کبھی ناکارہ نہیں بیٹھنے دیا...... خواہ وہ انکی کسی ناکامی کی صورت ہو یا کسی کامیابی کی جلالی و جمالی کیفیت اس طرح دیکھا جائے تو میر صاحب نے عیش کے مفہوم کی بھی یکسر صورت بدل کر رکھ دی۔ عیش یقیناً اُس انسانی کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کو ذہنی طور پر عافیت وخوبی کے ساتھ ساتھ ایک نشےؔ کا سا احساس بھی رہتا ہے۔ لیکن میر صاحب والے مفہوم عیش میں نشہؔ بھی گویا بصیرت کی ایک خوشگوار اور من موہنی صورت ہوتی ہے۔ پھر وہی بات کہ میر صاحب کا یہ مفہوم عیش کوئی خیالی بات نہیں ہے اِس مفہوم عیش کو تو میر صاحب اکثر و بیشتر اپنے تجربے میں لاتے رہتے ہیں۔ اُن کا یہ مفہوم عیش ہمہ وقت اُن کی تجربے کی گرفت میں رہتا ہے۔ اور شروع سے لے کر آخر تک۔

سمندر اور پلکیں

حقیقت یہ ہے کہ آنسو بہانے کا عمل اس قدر نازک اور لطیف عمل ہے جس کی نزاکتوں اور لطافتوں سے آدمی گذرتا تو رہتا ہے یعنی ان نزاکتوں اور لطافتوں کو وہ اپنے تجربے میں تو لے آتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ نزاکت گریہ اور لطافت گریہ اس کے عمل میں تو خود بخود آ جاتی ہے کیونکہ اسے یہ صلاحیت فطرت کی طرف سے ودیعت جو ہوتی ہے۔ یعنی یہ عطیۂ قدرت جو ہوا مگر اس عمل نزاکت و لطافت کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر بیان کیا بھی جاسکتا ہے تو شاعری کی زبان میں۔ اِدھر قدرت نے انسان کو شاعری کی زبان سمجھنے کی بھی صلاحیت مرحمت فرمائی ہے۔ مگر اس صلاحیت کی شرط یہ ہے کہ آپ اسے عمل میں لاتے رہیں یعنی آپ ادب پڑھتے رہیں۔ لیکن آج کل ادب جو کم پڑھا جاتا ہے تو میں اپنے خلوص افہام و تفہیم کے باعث اس حماقت میں مبتلا ہو گیا ہوں کہ شاعری کی اس زبان کو نثر کی زبان میں واضح کر دوں۔ سو مجھ سے یہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ .. میں اس کا اعتراف کر رہا ہوں..... اور اس اعتراف کے ساتھ اپنی اس حماقت افہام و تفہیم کو جاری بھی رکھے ہوئے ہوں ..... میر صاحب ایک بات کو شاعر کی زبان میں نہایت آسانی سے ادا کر جاتے ہیں اور جب میں اسے نثر کی زبان میں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے اپنی کم مائگی کا بری طرح احساس ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر میر صاحب کی ایک مشہور غزل کا ایک بہت ہی غیر معروف یا غیر مشہور سا شعر ہے۔ میں اس شعر کو غیر معروف یا غیر مشہور اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب بھی میر صاحب کی اس مشہور غزل کو سامنے لایا گیا اس شعر کو شامل نہیں کیا گیا۔ ..

بہر حال وہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔ ناصر کاظمی کے انتخاب میں یہ شامل ہے۔

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
تھا دست نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

اس شعر کے دوسرے مصرع میں جو ''دست نگر'' اور ''پنجۂ مژگاں'' کے الفاظ آئے ہیں غالباً ان الفاظ نے اس شعر کو سمجھنے میں ذرا مشکل پیدا کی ہے۔ اب چونکہ ہم لوگ ذرا سی مشکل کو بھی حل کرنے کی کوشش نہیں کرتے اس لیے اس شعر کو آج تک اس طرح نہیں سمجھا گیا جو اس کا حق تھا۔ بہر حال اس شعر میں میر صاحب نے رونے کے عمل سے متعلق اس قدر بلند اور لطیف و نازک بات بیان کر دی ہے جس کی داد دینا بھی مشکل نظر آتا ہے سوائے اس کے کہ بقول میر صاحب ہم یہی کہتے رہیں۔

''کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب''

اس شعر کی تفہیم کے ضمن میں یوں سمجھئے کہ میر صاحب حسب معمول عمل گریہ کی تعریف میں اس عمل کی وسعتوں گہرائیوں اور اس کے اتھاہ ہونے کا ذکر کر رہے تھے۔ اس پر کسی نے طنزاً کہا۔ ''میر صاحب کبھی سمندر بھی دیکھا ہے۔ اگر سمندر دیکھا ہوتا تو پھر اس طرح عمل گریہ کی تعریف نہ کر رہے ہوتے......سمندر کو دیکھو گے تو پتا چلے گا کہ پانی ایک جگہ کس قدر وسعت میں گہرائی میں اور کس قدر زیادہ جمع ہو سکتا ہے تب پتا چلے گا کہ سمندر کی طرح آنسو کبھی جمع نہیں ہوئے۔'' اس پر میر صاحب نے سمندر دیکھنے کے بعد جواباً یہ شعر کہا:

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جار کر
تھا دست نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

اس شعر زیر بحث کے پہلے مصرع میں جو ''بھی جا کر'' کے تین لفظ آئے ہیں اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ واقعی میر صاحب نے سمندر کو باقاعدہ دیکھا..... لیکن دوسرے مصرع میں کمال بلاغت کے ساتھ میر صاحب اعلان کر رہے ہیں ''بھائی جس سمندر کی گہرائی وسعت اور زیادہ تعداد میں پانی جمع ہونے کی تم تعریف کر رہے تھے وہی

سمندر ہم سے کہہ رہا تھا ارے صاحب میں کیا اور میری بساط کیا۔ انسان کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی پلکیں اگر مجھے کبھی چھولیتی تو یقیناً پھر اس گہرائی اور وسعت کا آپ کو اندزہ ہوتا کہ میں کس قدر حقیر اور کم مایہ ہوں اور انسان کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی پلکوں کی معمولی سی تری کس قدر وسعت گہرائی اور آب بقا کے سرمائے سے مالا مال ہے گویا انسان کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی پلکوں کی معمولی تری کا سمندر بھکاری ہے۔ وہ تمنا کر رہا ہے کہ کاش اسے چشم انسان کے پلکوں کی تری کا سرمایہ کبھی نصیب ہوسکے...... کاش انسان کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی پلکیں کبھی اسے چھولیں...... تو اس کی حیثیت میں بھی اضافہ ہو جائے۔ یہ بھی اپنے ہونے پر کچھ ناز کرنے لگے۔ جب تک سمندر کو کسی رونے والے انسان کی بھیگی ہوئی پلکیں نہیں چھولیں گی اس کی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہ ہوسکے گا۔

مرنے کے تجربے کی ایک نرالی زندگی پناہ توجیہہ
(میر تقی میرؔ کے ایک شعر کے حوالے سے)

وہی بات کہ شعر میر صاحب کا ہے اور بات میں کر رہا ہوں اور اگر اس شعر میں سے کوئی نئی بات نکل رہی ہے تو اس کا کریڈٹ میر صاحب ہی کو جانا چاہئے...... معدن اور کان جواہر سے جواہر نکالنا بھی اپنی جگہ ایک کوشش ضرور ہے لیکن اگر معدن میں ہی کچھ نہ ہو تو پھر اسے کھودنے والا اور اسکی کوشش کیا معنی رکھتی ہے۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ میر صاحب کے ایک شعر سے موت کا ایک بالکل نیا تصور ہمیں حاصل ہو رہا ہے مزید لطف کی بات یہ ہے کہ میر صاحب نے نہایت سادگی سے عوام کی منطق ہی کو استعمال کر کے وہ بات کہی ہے۔

یہ بھی انسان کی زبان کے کمالات میں سے ایک کمال ہے کہ ہماری روزمرہ کی گفتگو میں علم وحکمت کے ایسے ایسے جواہر موجود ہوتے ہیں کہ اگر ہم ان پر ذرا غور کریں تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہے۔ لیکن ہمیں اتنی فرصت ہی نہیں ملتی یا ہم اتنی فرصت ہی نہیں نکال پاتے کہ ان سامنے کے جواہرات سے مستفید ہو سکیں۔ بہرحال میر صاحب کا وہ شعر یہ ہے۔

جان کیا گوہر گرامی ہے
بدلے اس کے جہان دیتے ہیں

نہایت سیدھے سادھے انداز میں میر صاحب فرما رہے ہیں کہ ہماری جان بھی کوئی بہت ہی بے بہا موتی ہے کہ جس کے بدلے میں ہم یہ جہان تو دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن اپنی جان کے اس موتی کو اپنے آپ سے جدا نہیں کرتے گویا ہم مرتے کیا ہیں اپنی جان کو اس دنیا سے بچا لیتے ہیں یعنی اپنی جان کو اپنے پاس ہی رکھتے ہیں۔ ... مطلب یہ ہے کہ جب ہم مرتے ہیں تو جان ہمارے ہاتھوں سے نہیں نکل جاتی۔... بلکہ وہ مزید ہمارے نزدیک آ جاتی ہے یا مرنے پر ہم اپنی جان کو زیادہ اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں۔ اور جہان کو جو ایک ناپائیدار حقیقت ہے اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہیں سے وہ عجیب وغریب لیکن بے حد مضبوط اور معنی خیز نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم مرتے ہیں تو اس وقت یہ جہان ناپائدار اس قابل نہیں رہتا کہ وہ ہماری جان کی حفاظت کر سکے...... اور اس طرح دیکھا جائے تو یہیں سے وہ دوسرا نکتہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ہر آدمی کی جان کے لیے جو ایک وقت متعین اور مقرر ہے اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ ہر آدمی کی جان اس قدر اہم ہوتی ہے کہ اسکو یہ جہان ناپائیدار یہ بے ثابت کمزور دنیا ایک خاص عرصے تک کے لیے ہی سنبھال سکتی ہے اس سے زیادہ نہیں...... گویا موت کے وقت ہمارے دن پورے نہیں ہوتے یا ہمارا عرصۂ حیات اپنے خاتمہ پر نہیں آیا ہوتا بلکہ ہماری جان کو برداشت کرنے کی مدت اس دنیا کے لیے پوری ہو چکی ہوتی ہے یعنی ہماری جان کے حوالے سے اس دنیا کا حوصلہ اور ہمّت جواب دے چکے ہوتے ہیں رہا یہ سوال کہ آخر دنیا میں ایک ہم ہی تو پیدا نہیں ہوتے یا ایک ہمیں تو نہیں مرتے دوسرے لوگ بھی تو ہین جو ہماری موت کے وقت پیدا ہو رہے یا مر رہے ہوتے ہیں ..... تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر جان اپنے ساتھ دنیا کے لیے ایک حوصلہ اور ہمت بھی تو لے کر آتی ہے واضح رہے کہ ہر جان اپنے ساتھ توشۂ آخرت لے کر نہیں آتی توشۂ دنیا لے کر آتی ہے جس کو عرف عام میں صلاحیت اور استعداد کہتے ہیں جس کے ذریعے ہر جان اس ناپائیدار دنیا کو اپنی طرف سے بہت کچھ دیتی ہے اور اس کے بدلے میں لیتی بہت ہی کم ہے۔ ہاں یہ ایک الگ بحث ہے کہ ہم اپنے عجز وانکسار کے باعث یہ کہہ کر

اپنا محاسبہ کرتے رہیں کہ ہم نے دنیا کو کیا دیا۔ اور ایک طرح ہمارا یہ محاسبہ غلط بھی نہیں ہوتا کہ قدرت نے جس قدر ہمیں صلاحیت بخشی ہے جی ہاں اس دنیا کو بنانے اور سنوارنے کی صلاحیت اس سے ہم اس قدر فائدہ کہاں اٹھاتے ہیں؟... اور کب اٹھاتے ہیں؟.... کہاں اور کب کے الفاظ۔ ہمیں صاف صاف بتا رہے ہیں کہ ہمارے پاس زمان و مکان کی دولت کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہم کچھ کرنا چاہیں تو ہمارے لیے نہ کوئی وقت کی کمی ہے اور نہ جگہ کی..... بلکہ سچ پوچھیے تو قدرت نے ہمیں اس قدر صلاحیت اور استعداد بخشی ہوتی ہے کہ ہم اپنے لیے اپنے زمان و مکان بھی خود تخلیق کر سکتے ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا میر صاحب کے اس شعر زیر بحث نے ہم پر زندگی کا کس قدر اہم نکتہ واضح کیا کہ مر کر ہم اپنی جان گنواتے نہیں بلکہ اس کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اور اگر یہ دنیا ہماری طرف سے جاتی بھی ہے تو اس ناپائیدار دنیا کی اوقات ہی کیا ہے جی ہاں ہماری جان کے مقابلے میں اس دنیا کی اوقات...... اور دنیا کی کتنی اوقات ہے میر صاحب نے اپنے زیر بحث شعر میں اسے بھی واضح کر دیا ہے اور یہ وضاحت صرف ایک چھوٹے سے لفظ ''کیا'' کے ذریعہ ہوئی ہے۔ ..غور فرمائیے...... میں یہ شعر پھر لکھ رہا ہوں۔

جان کیا گوہر گرامی ہے
بدلے اس کے جہان دیتے ہیں

لفظ ''کیا'' سے جہاں جان کے گوہر گرامی کی عظمت اور بڑائی کا احساس ہوتا ہے وہاں جہان ناپائیدار کے چھوٹے پن کا بھی کہ اس جان کے عوض ہم اس دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا جان ہے تو جہان ہے جیسی عام سی کہاوت کو کس طرح میر صاحب نے اس شعر میں خاص چیز بنا دیا ہے جان اور جہان کا کوئی مقابلہ نہیں رہا...... جان ہے تو صرف جہان ہی نہیں جہان سے کہیں آگے کی دولت ہمارے لیے

خاص ہو جاتی ہے۔ اور یوں میر صاحب نے مرنے کے تجربے کو کس طرح بالکل ایک انوکھی توجیہہ سے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ گویا ہم بوڑھے نہیں ہوتے یہ جہان ناپائیدار بوڑھا ہو جاتا ہے کمزور ہو جاتا ہے ہر جان کے حوالے سے...... ہر جان کو سنبھالنے کے لیے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس جہان ناپائیدار کے پاس ایک خاص وقت تک کی طاقت و ہمت ہوتی ہے جیسے ہی وہ مجوزہ اور معینہ وقت آتا ہے اس جہان ناپائیدار کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ موت کے وقت ہم اپنے پاس سے کچھ نہیں گنواتے یہ دنیا ہمیں گنوا دیتی ہے...... ہمارے قوا میں کوئی اضمحلال پیدا نہیں ہوتا اس دنیا کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں۔ مرنا اس مادی دنیا کی ناطاقتی اور ناپائیدار کو ظاہر کرتا ہے دوسرے لفظوں میں مرنے کا تجربہ ہم پر وارد نہیں ہوتا اس مادی دنیا پر وارد ہوتا ہے۔ مرتے ہم نہیں یہ دنیا ہمارے جان کے حوالے سے مرتی ہے۔ اس کے ضعف اور ناتوانائی آشکار ہوتے ہیں۔ ہم اپنی جان کے بلند مرتبہ اور قیمتی موتی کو بچانے کی خاطر اس دنیا کو قربان کر دیتے ہیں۔ اور ہماری اس قربانی کے بدلے میں ہماری جان کا یہ گوہر گرامی ایک عجیب عالم دوام کے حوالے ہو جاتا ہے جس میں امکانات کا کوئی ٹھکانہ نہیں...... ارتقاء کے بے شمار آفاق مرنے کے بعد ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

میر صاحب نے جان کو گوہر گرامی کہہ کر ہم پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ہماری جان کا یہ موتی کہیں اوپر سے نہیں اتر کر آتا بلکہ اسی جہان ناپائیدار کے سمندر سے نکلتا ہے۔ اور اسی جہان ناپائیدار سے نکلا ہوا یہ موتی ہمیں اس قدر عزیز ہو جاتا ہے کہ پھر ہم اس موتی کے بدلے میں پورے جہان ہی کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن اس موتی کی آبرو بہر طور قائم رکھتے ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو یہ سیدھا سادا سا شعر میر صاحب کے فن شعر گوئی کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس میں موت کا تجربہ اپنے دامن میں بے شمار نکات حیات افروز سے مالا مال نظر آتا ہے۔ اور میری دانست میں یہ سب کچھ میر صاحب کے بلانوش ہونے کا نتیجہ ہے کہ کس طرح وہ آلام روزگار کی تلخیوں کو پی کر خود میں بلا کی توانائی پیدا کر لیتے ہیں۔

نامرادانہ زیست

(زندگی گذارنے کا ایک بالکل نیا تصور...... میر تقی میر کے ایک شعر کے حوالے سے)

یہ حقیقت ہے کہ میر صاحب کے شعر اس ذہنی سطح پر مشہور نہیں ہیں جس ذہنی سطح پر غالب کے شعر مشہور ہیں۔ پھر بھی میر صاحب کا ایک نسبتاً کم مشہور شعر بات کرنے کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

نامرا دانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

یہ شعر جس طرح کا زور دار شعر ہے اور جس فکری اور جذباتی انداز کا طرحدار شعر ہے میں نہیں سمجھتا کہ اس شعر کو اس طرح سمجھا بھی گیا ہے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ شعر بھی میر صاحب کے دوسرے شعروں کی طرح حزن و یاس سے بھرا ہوا شعر ہے۔ حالانکہ ایسی بات ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ ہمارے ہاں شعر فہمی کے لیے لب ولہجہ کی اہمیت کو سمجھتے تو ہیں لیکن عموماً اس کو استعمال نہیں کرتے۔ بس لفظوں کے سطحی معنی کو سامنے رکھ کر مفہوم نکال لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس شعر کی تفہیم میں بھی کچھ اسی طرح کا رویہ بروئے کار لایا جاتا رہا ہے۔ جبکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔

اوّل تو میر صاحب کے اس شعر کو اس کے صحیح لب و لہجے کے ساتھ پڑھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے صحیح مفہوم کا بہت کچھ اظہار اسی حوالے سے نہ ہو جائے۔ اس کے بعد الفاظ کے معانی کی بات آتی ہے۔ یہاں بھی ذرا غور کریں تو ایک بالکل

نئے انداز کے طمطراق والی فضاء پیدا ہوتی ہے۔ پہلے مصرع کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے اور خاص طور سے لفظ زیست پر زور دیا جائے تو اس مصرع کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ ٹھیک ہے نامرادانہ ہی سہی یعنی کسی مراد کسی خواہش یا کسی دعا کے بغیر ہی سہی وہ زیست تو کرتا تھا یعنی وہ زندہ تو تھا اُسے اپنی زندگی کا بھرپور احساس تو تھا۔ زندگی کا بھرپور احساس ہونا کوئی معمولی بات ہے کیا اور یہی وجہ ہے میر کا زندگی گذارنے کا یہ طور یہ طریقہ ہمیں یاد ہے ہم اس کے اس زندگی گذارنے کے انداز کو فراموش نہیں کر سکتے۔ آرزوؤں مرادوں کے ساتھ تو سبھی زندگی گذارتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آرزوؤں اور مرادوں کے ساتھ زندگی گذارنے میں زندگی سے زیادہ آرزوؤاں اور مرادوں کے جھمیلے میں آدمی پھنس جاتا ہے اور یوں پھنس کر صحیح معنی میں وہ قدرت کی عطا کردہ زندگی کا شکر ادا نہیں کر سکتا...... خالص زندگی گذرانا بہت اونچی اور بہت بلند چیز ہے جسکو اس آرزوؤں اور مرادوں میں ملوث ہو کر زندگی گذارنے میں محسوس کرنا بہت مشکل کام ہے۔

سچ تو یہ ہے ہم کو اس شعر میں میر صاحب نے خالص زندگی کا ایک بہت ہی بلند اور بہت ہی اعلیٰ تصور پیش کیا ہے...... اور سب سے زیادہ قابل قدر بات یہ ہے کہ میر صاحب کی زندگی جی ہاں درد والم سے بھرپور زندگی کے ہوتے ہوئے اس تصور کے عملی امکانات بھی ہم پر ساتھ ہی ساتھ منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں یعنی اس شعر میں میر صاحب نے فقط شاعری نہیں فرمائی اپنے ایک نہایت بلند و وقیع تجربے کا اظہار کیا ہے۔ اس شعر میں زندگی کی اہمیت کا احساس اور اس کی مدافعت ایک ایک لفظ سے چھلک رہی ہے۔ نامرادانہ زیست کرتا تھا...... نامرادانہ کی صداقت اپنی جگہ زیست کی صداقت اپنی جگہ اور کرتا تھا کی عملی صداقت اپنی جگہ ہم اس مصرع کو جتنے بھی یقین اور وثوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں اسی نسبت سے اس مصرع کی عملی صورت ہمارے سامنے آتی چلی جاتی ہے...... اور پھر دوسرے مصرع کے ذریعہ جو پہلے مصرع پر مہر صداقت ثبت کی گئی ہے اس مشاہدۂ یقین کی بھی داد نہ دینا...... بے انصافی ہوگی...... ''میر کا طور یاد ہے ہم کو'' بھئی میر اس طرح زندگی بسر کرتا تھا کہ ہم اسے کسی طرح بھی فراموش نہیں

کر سکتے۔ ہمیں میرؔ کی زندگی گذارنے کا ایک ایک لمحہ یاد ہے اور یاد آتا ہے اور جیسے جیسے ہمیں میرؔ کا یہ طریقۂ حیات یہ طور زیست یاد آتا ہے زندگی کے ایک بالکل جداگانہ اور بالکل نئے تصور سے ہم صرف ایک لمحے کو ہی دو چار نہیں ہوتے مسلسل دوچار ہوتے چلے جاتے ہیں..... مطلب یہ ہے کہ میر کے نامرادانہ زیست کے طور پر جتنا سوچتے ہیں اس کی نئی نئی راہیں نئے نئے ابواب ہم پر کھلتے چلے جاتے ہیں..... ہمیں بار بار خیال آتا ہے میرؔ کوئی خیالی کردار نہیں تھا۔ اس نے زندگی میں جس طرح آلام و مصائب کا مقابلہ کیا اس کی طرف سے اس میں کسی مثالی کردار کی عمداً شمولیت ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔ بس وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ آدمی کو ڈٹ کر زندگی گذرانی چاہئیے اور ڈٹ کر زندگی گذارنا ہر آدمی کے لیے ممکن ہے..... جب میر کے لیے ممکن ہے تو دوسرے لوگوں کے لیے ممکن کیوں نہیں اور بعض اوقات آپ کہہ سکتے ہیں اکثر اوقات میر کے لفظوں میں یا ویسے یعنی جو ایک تعلّی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے تو اس کے پیچھے اگر ہم غور کریں تو میرؔ کی تعلّی نہیں ہوتی جتنی صداقت پر یقین کی ایک صورت کا اظہار ہوتا ہے۔ میں میر کے اس پہلو پر کبھی الگ بھی بات کرونگا۔

میر صاحب کا تصورِ مے نوشی

''صحبت شراب سے آگے کا سفر''

میں نے جیسا کہ اس کتاب کے دیباچہ میں عرض کیا ہے میر صاحب کے کلام کو خصوصاً ان کی غزل کو سمجھنے کے لیے انکا یہ شعر کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پُرخوں کی اک گلابی سے

جہاں تک میر صاحب کے سوانح کا تعلق ہے اس سے تو یہ پتا چلتا ہے جیسے میر صاحب نے شراب کو کبھی منہ تک نہیں لگایا۔اور وہ اس شعر میں یہ کہہ رہے ہیں عمر بھر ہم رہے شرابی سے تو پھر وہ کس قسم کے شرابی تھے اور ان کا تصورِ مے نوشی کیا ہے...... یہ سوال اپنی جگہ خاصا اہم ہے اور میں اس سوال کا جواب دینے کی یہاں کوشش کروں گا۔ اور میر صاحب ہی کے ایک دو شعروں کی روشنی میں میرا یہ جواب ہوگا ہاں تو میر صاحب کا ایک شعر ہے۔

کیا جانوں بزم عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ
میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا

یہ لیجئے اس شعر میں تو میر صاحب یہ کہہ رہے ہیں وہ شراب پینے کے لیے شراب خانہ تک تو ضرور گئے ہیں لیکن جیسے ہی انہوں نے ساقی کی آنکھیں دیکھی وہ

شراب خانے کی فضاء سے آگے نکل گئے۔ اور پھر وہ شراب خانے جانے کی اپنی صفائی بھی پیش کر رہے ہیں۔ ''کیا جانوں بزم عیش'' مطلب یہ ہے کہ جس طرح عام لوگ شراب خانے جا کر شراب پیتے ہیں عیش مناتے ہیں اس طرح کی بات انہوں نے نہیں کی......لیکن میر صاحب کی یہ صفائی عام آدمی کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہے تاکہ وہ میر صاحب کی واقعی شراب نوشی کو سمجھ سکے۔ صحبت شراب سے آگے نکلنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میر صاحب زندگی سے سرور و کیف اخذ کرنے یا کشید کرنے کے قائل نہیں تھے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو میر صاحب سے بڑا شرابی ہمیں شاید ہی کوئی مل سکے۔ کیونکہ وہ خود کشید کردہ شراب کے قائل تھے۔ ویسے تو اس کائنات کی ہر شے ایک میخانہ ہے ہر شے سے آپ جتنی چاہے شراب حاصل کر سکتے ہیں لیکن ان تمام اشیاء میں انسان کا بدن ایک ایسا شراب خانہ ہے جس کی شراب کا نشہ اور کیف و سرور سب شرابوں سے مختلف حیثیت رکھتا ہے۔

شعر زیر بحث ہی کو دیکھ لیجئے شاعر نے ساقی کی آنکھ دیکھی اور پھر وہاں سے اس نے ایسا نشہ حاصل کیا کہ جس کو پا کر وہ عام سرور و کیف کے عالم سے کہیں آگے نکل گیا۔ میں نے آگے نکلنے کی بات شعر کے مطابق نہیں کی شعر میں تو سفر کرنے کی بات ہے اور آپ جانتے ہیں آدمی سفر اسی وقت کرتا ہے جب اس کے سامنے کوئی منزل ہوتی ہے۔ چنانچہ شاعر نے ساقی کی آنکھ میں کسی منزل کا اشارہ پا لیا اور وہ میکدہ کی عام بزم عیش کو پیچھے چھوڑ کر آگے سفر پر نکل گیا۔ سفر کا لفظ ہمیں یہ بھی بتا رہا ہے کہ سرور و کیف کی ایک منزل یہ بھی ہے کہ آدمی اس کے لیے مسلسل سفر میں رہے مسلسل کیف و سرور حاصل کرتا چلا جائے۔ یوں دیکھا جائے تو ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ میر صاحب کی مے نوشی کے لیے کوئی زمان و مکان کی قید نہیں اس سے ہر وقت اور ہر جگہ مستفید ہوا جا سکتا ہے۔

یہاں میں غالب کی مے نوشی اور میر صاحب کی مے نوشی کا فرق واضح کرنا چاہوں گا۔ تاکہ میری بات کی وضاحت ہو سکے...... مثال کے طور پر ''یک گونہ بے خودی

مجھے دن رات چاہئے'' کے میر صاحب بھی قائل تھے اور غالب بھی کہ یہ مصرع غالب ہی کا ہے۔ مگر دونوں کی مے نوشی میں فرق یہ ہے کہ غالب عام شراب پی کر ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ وہ رات دن یک گونہ بے خودی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ میر صاحب عام شراب پیئے بغیر دن رات کی یک گونہ بے خودی کے خواہاں ہی نہیں وہ تو اس بے خودی کے عالم سے ہمہ وقت گذر بھی رہے ہیں۔ چنانچہ میر صاحب کا شراب کے نشے میں رہنا ایک بالکل مختلف سی کیفیت حیات کا نام ہے لیکن اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ میر صاحب نے اپنی اس مے نوشی کو اختیار کر کے زندگی گذارنا کا بہت حوصلہ حاصل کیا۔ اور اس نشۂ ہمت کے ذریعہ انہوں نے زندگی کے ایسے ایسے مصائب و آلام کا مقابلہ کیا جس کو عام آدمی تو بے چارہ برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا اور عام آدمی بھی کیا نام نہاد خواص میں تو ان مصائب کو برداشت کرنا کی ذرا سی بھی ہمت نہیں ہوتی۔

خدا رسیدہ

انسان کا سب سے بڑا اعزاز

ایک عام بندۂ خدا کی جس قدر عزت و آبرو میر صاحب نے اپنے ایک شعر کے ذریعے دریافت کی ہے میں سمجھتا ہوں کم از کم اردو شاعری میں میری نظر سے اور کہیں نہیں گذری...... میں تو اس ضمن میں یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اس انداز کا شعر دنیا کے کسی شعری ادب میں شاید ہی کہیں نظر آئے وہ شعر یہ ہے۔

بندے کے دردِ دل کو کوئی نہیں پہنچتا
ہر ایک بے حقیقت یاں ہے خدا رسیدہ

کمال بلاغت کی وجہ سے ہمیں اس شعر کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا ہوگا......
پہلا لفظ بندہ ہے اور آپ جانتے ہیں بندہ اسے کہتے ہیں جو اپنے مالک کی مرضی کے ساتھ اس طرح بندھا ہوتا ہے کہ وہ اپنے مالک اپنے خدا کی مرضی کے خلاف ذرا سا بھی کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ ممکن ہے آپ فرمائیں کہ بندہ کی جو یہ تعریف کی گئی ہے اس کا خیال کون کرتا ہے۔ میں جواباً عرض کروں گا کہ آپ کی یہ بات صد فی صد درست ہے لیکن آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہر بندہ کے لاشعور میں یہ خیال پوری طرح گھر کیے ہوئے ہوتا ہے کہ اس کی زندگی جب اس سے پوچھ کر عطا نہیں کی گئی تو حقیقتاً ہمارا مالک ہمارا خدا ہی ہے جس نے ہمیں پیدا کیا۔ بس اسی لاشعوری احساس کے

باعث ہر بندہ اپنے خدا سے خاص راز دارنہ انداز میں اپنی خاص انفرادی خواہش کو پیش کرنا اپنا حق سمجھتا ہے گویا اس لاشعوری احساس کی وجہ سے ہر شخص میں ایک انفرادایت فوراً آ جاتی ہے۔ بندہ کے بعد جو لفظ آتا ہے وہ درد ہے اور درد بھی دل کا...... جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا گیا ہے یہ دردِ دِل وہی خاص انفرادیت لیے ہوئے انفرادی انداز کی خواہش ہوتی ہے جو بندہ اپنے خدا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور اس ناز سے کہ اس خواہش کو اس کا خدا قبول کرے نہ کرے اسے سنے گا ضرور...... اس طرح یہ انفرادی خواہش ہر بندہ کو اس کے خدا تک پہنچا دیتی ہے اور یوں ہر بندے کا خدا تک پہنچنا بہت ہی واضح انداز میں ثابت ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے مصرعے میں جو ''ہر ایک بے حقیقت'' کے الفاظ آئے ہیں ان سے اس حقیقت پر مزید روشنی پڑتی ہے کہ خدا کی مرضی کے خلاف بڑے بڑے لوگ تو کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں اور اٹھاتے رہتے ہیں لیکن معاشرے کا ایک عام شخص جس کی اس کے معاشرہ میں کوئی خاص حیثیت اور اہمیت نہیں خدا کی نظر میں ایک انفرادی حیثیت کا حامل بن جاتا ہے اور یوں اس اعتبار سے اس عام بندے کی خدا تک رسائی مسلم ہو جاتی ہے...... اور یہ کوئی کم اہمیت کی بات نہیں...... بہت بڑی بات ہے۔ بندے کا خدا تک پہنچ جانا...... خدا رسیدہ کہلانا جسے ہماری عام زبان میں ''پہنچا ہوا'' کہتے ہیں۔

کسی تکلف کے بغیر عرض کر رہا ہوں مجھے میر صاحب کے اس شعر نے ایک تو اس دنیا کے ہر شخص کی ہر بندۂ خدا کی عزت کرنا صحیح معنی میں سکھایا۔ دوسرے صحیح معنی میں اپنے ابنائے جنس سے محبت کرنا بھی۔ احترام اور محبت کو میں نے اس سے پہلے اس طرح ایک جان دو قالب کبھی نہیں محسوس کیا۔ اور وہ بھی ہر شخص کے لیے۔ پھر احترام اور محبت کے علاوہ ایک چیز دردمندی بھی ہوا کرتی ہے۔ مجھے صحیح معنی میں دردمندی سے بھی میر صاحب کے اس شعر نے آشنا کیا ہے۔ اب مجھے اپنا دشمن بھی میری دردمندی کا مستحق نظر آتا ہے۔ اور پھر کسی سے میری دشمنی بھی کیا اور کیوں؟ اور کس لیے؟ آج کی دُنیا میں جی ہاں شاید آپ سن کر حیران ہوں کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اب کم از کم

دشمن کا کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا۔ اب تو آپ زیادہ سے زیادہ خود غرض کو دشمن میں تبدیل کر سکتے ہیں اور یہ کوئی اہم بات نہیں...... ہاں یہ ایک الگ سوال ہے کہ انسان کی جدید ترقی نے اہمیت کے لفظ کے کوئی معنی ہی باقی نہ چھوڑے ہوں اور غیر اہم باتیں ہی ہمارے لیے اہم باتیں بن گئی ہیں...... جو سراسر ہمارے ذہن کی کجی کے علاوہ اور کچھ نہیں جس کو ہم اگر چاہیں تو دور کر سکتے ہیں...... مزے کی بات یہ ہے کہ انسان کے لیے جس طرح اپنے ذہن کے ٹیڑھے پن اس کی کجی کو دور کرنا بظاہر مشکل نظر آتا ہے اتنا ہی باطنی اعتبار سے ہمارے لیے یا انسان کے لیے یہ ایک بہت ہی آسان کام بھی ہے...... البتہ یہ ایک مسئلہ الگ حیثیت رکھتا ہے کہ انسان آجکل ظاہر سے زیادہ الجھ رہا ہے اور مختلف فلسفوں کے تحت ظاہر ہی کو سب کچھ سمجھنے لگا ہے ورنہ باطن کی طرف متوجہ ہونا اپنی جگہ وقیع کام بھی ہے اور جتنا وقیع ہے اتنا ہی دلچسپ اور پائیدار بھی............۔

ہاں تو عرض یہ کر رہا تھا کہ میر صاحب کے اس شعر نے مجھے اتنا کچھ دیا ہے جتنا شاید میں تصوف میں کئی درجات سے گذرنے کے بعد بھی حاصل نہ کر سکتا...... غالباً اسی صورت حال کے پیش نظر میر صاحب نے ایک دوسرے جگہ اس طرح فرمایا ہے۔

دل عجب نسخۂ تصوف ہے
ہم نہ سمجھے بڑا تاسف ہے

اس شعر کا دوسرا مصرع آج کے جدید نظریات کے لیے کہا گیا ہے۔ آدمی کے جانور پن کے لیے جدید سائنس نے اس قدر انکشافات اور ایجادات سے آدمی کا دامن بھر دیا ہے کہ اس غریب کو اپنی آدمیت بھی اس جانور پن میں نظر آنے لگی ہے۔ سارا مسئلہ ہمارے غور نہ کرنے کا ... اب اس کے لیے کوئی پیغمبر تو آنے سے رہا اب تو انسان کو خود اس ضمن میں پیغمبری دکھانی پڑے گی۔

برق اور آشیانہ کی نئی روایت

ہماری غزل کی روایت میں یہی بات چلی آ رہی ہے کہ بلبل یا کوئی اور طائر چمن میں آشیانہ تعمیر کرتا ہے تا کہ وہ بہار چمن سے اچھی طرح مستفید ہو سکے لیکن آشیانہ ابھی بنتا ہی ہے کہ اس پر بجلی گرتی ہے اور اُسے جلا کر ختم کر ڈالتی ہے۔

لیکن میں ذیل میں میر صاحب کے دو شعر پیش کر رہا ہوں آپ ان سے اندازہ لگائیں کہ موصوف نے کس طرح غزل کی اس فرسودہ روایت کو بالکل ایک نئی صورت دے ڈالی ہے۔ پہلے ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

چمن میں دیکھ نہیں سکتے ٹک کہ چبھتا ہے
جگر میں برق کے تنکا مجھ آشیانے کا

میر صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ہم چمن کی بہار دیکھنا چاہتے ہیں اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں بے فکر ہو کر اپنے آشیانے میں بیٹھے اس رت سے فیض یاب ہونا چاہتے ہیں لیکن بجلی ہے کہ بار بار چمکتی ہے اور ظاہر ہے وہ کسی وجہ سے بھی چمکے ہماری آنکھیں خیرہ تو ہوں گی ہم ڈسٹرب تو ہوں گے اب یہ الگ بات ہے کہ بجلی کیوں چمکتی ہے آپ شاید یہ سن کر حیران ہوں کہ بجلی یا برق چمکتی اس لیے ہے کہ ہمارے آشیانے کا ایک ایک تنکا اس کے جگر میں چبھتا ہے۔ یعنی ہم نے پہلے ہی سے اپنے آشیانے کو اس مضبوط ارادہ سے تعمیر کیا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے ہم چمن سے بھاگیں گے یا نکلیں گے نہیں چنانچہ ہمارے ارادہ کی اس پختگی نے ہمارے آشیانے کے تنکے تنکے میں ایک ایسی توانائی ایک ایسا کرنٹ بھر دیا ہے جو بجلی کو بھی پریشان کر رہا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ

ہمارے آشیانے پر گرنے کی جرأت کرے ہمارے آشیانے کا ایک ایک تنکا اسے پریشان کرڈالتا ہے جس کے نتیجے میں وہ یعنی بجلی صرف چمک کر رہ جاتی ہے۔

مجھے اپنی کم مائگئی مطالعہ کا اقرار ہے میں نے اس طرح کا خیال کہیں نہیں پڑھا۔ یہاں میر صاحب پھر ایک طرح دار اور اپنے ہی ٹھاٹ باٹ کے شاعر نظر آرہے ہیں...... میر صاحب کا پیغام یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ دشمن ہم پر حملہ آور ہو ہم اپنے آپ کو اپنی جگہ دشمن ہی کے ہتھیاروں سے خود کو لیس کیوں نہ کرلیں۔ اور دشمن کا ہتھیار دکھ درد کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے جس سے میر صاحب خوب آشنا تھے۔ آیئے اب ہم دوسرے شعر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ میر صاحب کا دوسرا شعر یہ ہے۔

کوئی بجلی کا ٹکڑا اب تلک بھی

پڑا ہوگا ہمارے آشیاں میں

میر صاحب کا کوئی دوست کہہ رہا ہے ''میر صاحب آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ آپ فرمارہے ہیں کہ زندگی کے درد و آلام سے کیا گھبرانا۔ ارے صاحب یہ تو بجلی کی طرح آدمی پر گرتے ہیں''...... میر صاحب جواب میں کہتے ہیں ''ارے بھائی اس سے پہلے کہ یہ درد و آلام آپ پر بجلی کی طرح گریں آپ انہیں اپنے قابو میں کیوں نہیں کرتے''...... وہ کیسے؟...... ''اپنی جرأت و ہمت سے'' آدمی درد و آلام کے مقابلے میں ڈٹ جائے تو یہی درد و آلام اس کی طاقت بن جاتے ہیں۔'' وہ دوست کہتا ہے ''میر صاحب یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔'' اس پر میر صاحب اس بے خبر دوست کو اپنی دکھ بھری زندگی کا کوئی باب سناتے ہیں پھر بھی وہ کوئی ثبوت مانگتا ہے تو اس کے جواب میں میر صاحب اپنا یہ شعر پڑھتے ہیں۔

کوئی بجلی کا ٹکڑا اب تلک بھی

پڑا ہوگا ہمارے آشیاں میں

مطلب یہ ہے کہ میر صاحب کہہ رہے ہیں میری زندگی کو ذرا غور سے مطالعہ کرو تمہیں کوئی نہ کوئی مضبوط قسم کا ثبوت ایسا مل جائے گا جس سے تمہیں میری دکھ بھری

زندگی کی توانائی کا اندازہ ہو جائے گا۔ میر صاحب کے آشیانہ حیات پر درد و آلام کی بجلیوں پر بجلیاں گرتی رہی میر صاحب ان کا مقابلہ کرتے رہے کسی غم کو یعنی کسی بجلی کو کسی ایک طرح ٹھکانے لگایا تو دوسرے غم یعنی دوسری بجلی کو کسی دوسری طرح ٹھکانے لگا ڈالا...... پھر بھی ثبوت کے طور پر کسی نہ کسی غم کا کوئی حصہ یعنی کسی نہ کسی بجلی کا کوئی ٹکڑا تو اب بھی ہمارے گھر کے یعنی ہمارے آشیانے کے کونے کھدرے میں پڑا ہوگا اور اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہوگا کہ ہم کس طرح اپنے غموں کا مقابلہ کرتے رہے ہیں اور اب انہیں پھر کسی وقت کام آنے کے لیے کس طرح پڑا رہنے دیا ہے۔

میر صاحب کی حکمتِ عملی

(جرأت رندانہ اور جسارت فرزانہ کے ساتھ)

اس مختصر سی زندگی میں انسان کا آنا اور پھر کچھ کرنا یا کر گذرنا ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ میر صاحب کا نظریہ اس اہم مسئلہ کے بارے میں بہت عام سا بھی ہے اور خاص بھی...... عام اس طرح کہ میر صاحب اس بات پر صدقی صد یقین رکھتے ہیں کہ اس دنیا میں آ کر آدمی کو کچھ نہ کچھ کرنا تو ضرور چاہیئے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے کوئی بات بھی تو نہیں بنتی اسی لیے فرماتے ہیں۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

لیکن دیکھ لیجئے اس عام سے نظریۂ عمل میں بھی میر صاحب نے کیا کیا خاص شرطیں لگا دی ہیں ایک تو یہی کڑی شرط ہے کہ ہم یہ بات سننے کے لیے تیار نہیں کہ آپ غمزدہ رہے یعنی آپ پر بہت غم ٹوٹے یا اسی طرح بہت خوش رہے غم اور خوشی کچھ کر گزرنے کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہونے چاہئیں۔ آدمی کو زندگی ملی ہے تو غم یا خوشی ان میں سے کوئی نہ کوئی صورت حال تو سامنے رہے گی ہی پھر کچھ نہ کرنے کے ضمن میں یہ کون سا معقول بہانہ ہے یا عذر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ میر صاحب نے بظاہر اس سادہ سے نظریہ عمل میں ایک اور کڑی شرط عائد کی ہے اور وہ یہ کہ "ایسا کچھ کر کے

چلو یاں کہ بہت یاد رہو۔'' تو جناب میر صاحب کی سادگی سے خدا بچائے۔ ایک تو کچھ کرو اور پھر کرو بھی ایسا کچھ کہ لوگ تمہیں یاد کریں۔ اور تھوڑا بھی نہیں بہت یاد کریں اور تم انہیں بہت یاد رہو...... یا بہت یاد آؤ...... ایسا معلوم ہوتا ہے میر صاحب انسان کے عمل سے متعلق بہت ارفع واعلیٰ خیال رکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں آدمی جو کچھ عمل بھی خلوص کے ساتھ دل لگا کر کرے گا وہ ایسا خود بخود ہو جائے گا کہ اسے لوگ بہت یاد رکھیں گے۔ میر صاحب کے نزدیک بنیادی شرط صرف ایک ہی کہ آپ کچھ کر کے دکھائیں یا آپ کچھ کریں اور یہ سب کچھ خلوص کے ساتھ ہو تو کوئی وجہ نہیں اس عمل میں جاودانی کیفیات پیدا نہ ہو جائیں۔

البتہ میر صاحب نے اس ضمن میں ایک راہ ضرور دکھا دی ہے۔ اور یہ راہ بھی بظاہر سیدھی سادی نظر آتی ہے لیکن کچھ کر گذرنے کے معاملے میں یہ بہت کام کا مشورہ ہے۔ تو ملاحظہ فرمائیے۔

عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا
آدمی ہووے کسی پیشے میں جرأت چاہیئے

کچھ کر گذرنے کے معاملے میں آدمی اکثر یہی سوچتا رہتا ہے اور اسی کشمکش کا شکار رہتا ہے کہ اسے کونسا پیشہ اختیار کرنا چاہیئے جس میں وہ اپنی خدا داد صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے۔ کبھی ایک پیشے کے بارے میں سوچتا ہے تو کبھی دوسرے پیشے کا اسے خیال آتا ہے کہ فلاں پیشہ اس کے لیے زیادہ مناسب ہے اور اسی کشمکش میں اسکی ساری زندگی گذر جاتی ہے۔ میر صاحب نے آدمی کو اس کشمکش سے نکالنے کے لیے کیا خوب مشورہ دیا ہے۔

عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا
آدمی ہووے کسی پیشے میں جرأت چاہیئے

کچھ کر گذرنے کے لیے مسئلہ یہ نہیں کہ کونسا پیشہ اختیار کیا جائے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آدمی عمل کے لیے قدم اٹھاتا ڈرتا ہے۔ یہ ڈر دور کر لیا جائے تو پھر آدمی جو قدم

بھی اٹھائے گا اس میں کچھ کر کے دکھا جائے گا۔ آپ جس پیشے میں بھی ہیں اس میں عمل کے مواقع موجود ہوتے ہیں۔ Scope سکوپ ہر جگہ ہے آگے بڑھنے کی دیر ہوتی ہے۔ تو پھر آگے بڑھتے ہوئے قدموں کے سامنے راہیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں دیکھ لیجئے۔ بقول میر صاحب پتھر توڑنا کونسا بڑا پیشہ ہے فرہاد نے اس عام سے پیشے میں جرأت دکھائی اور مشہور ہو گیا۔

اس کے علاوہ میر صاحب نے عمل میں جرأت پیدا کرنے کی کچھ مثالیں اپنے پروارد کر کے دی ہیں بہت دلچسپ ہیں ایک مثال یہاں پیش کر رہا ہوں۔

کب تلک یوں لُوہو پیتی ، ہاتھ اٹھا کر جان سے
وہ کمر کولی میں بھر لی ہم نے کل خنجر سمیت

میر صاحب کا معشوق ایک خاص ادا کے ساتھ کمر میں خنجر لگائے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ معشوق کی کمر دیکھ کر میر صاحب کا جذبات کے مارے برا حال تھا۔ انہوں نے سوچا معشوق کا اس طرح سامنے آنا تو ہمیشہ ان کا خون پیتا رہے گا اُدھر معشوق کی کمر میں خجر بھی تھا یہ اندیشہ غلط نہ تھا کہ اگر کوئی دست درازی کی گئی تو معشوق خنجر گھونپ کر جان ہی سے نہ مار ڈالے۔ مگر میر صاحب نے جرأت دکھائی سوچا یہ کمر کب تک ہمارا خون پیئے گی لہٰذا جان کا خوف کیے بغیر انہوں نے معشوق کو کمر سے پکڑ کر اپنی آغوش میں لے لیا...... گویا میر صاحب براہِ راست ایکشن کے بھی قائل تھے۔ اسی زمین ہی میں میر صاحب کا ایک اور شعر ہے جو کمال دلچسپی کا حامل ہے۔ میر صاحب شرم گناہ سے دھاڑیں مار کر رونے لگے لیکن میر صاحب روئے اس درد کے ساتھ کہ واعظ جو منبر پر بٹھا تھا وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر واعظ پر کیا گذری قابل دید صورت حال ہے۔

مستی میں شرم گنہ سے میں جو رویا دھاڑ مار
گر پڑا بے خود ہو واعظ جمعہ کو منبر سمیت

واضح رہے کہ واعظ کو میر صاحب کی درد بھری آہ وزاری نے بے خود کر دیا تھا۔

میر صاحب کا ایک اور شعر بھی ہے جس میں انہوں نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ جب معشوق عاشق کے گھر آئے۔ اور اتفاق سے عاشق کے پاس اس کی خاطر تواضع کے لیے گھر میں کچھ نہ ہو تو اس وقت معشوق کی خاطر تواضع کس طرح کرنی چاہیے۔ بس یہاں بھی جرأت دکھانے کی بات ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جرأت سب سے بڑی دولت ہے اور ہر طرح کے افلاس کا حل بھی...... فرماتے ہیں۔

آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یاں جو نثار کریں
الا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں

ہزار ناداری کا عالم ہو یہ عاشق کی طرف سے ایسی خاطر تواضع ہے جس پر معشوق کبھی کوئی اعتراض نہیں کر سکتا اعتراض تو بڑی بات ہے دراصل اسی طرح کی خاطر تواضع تو معشوق کو عمر بھر کے لیے اپنا بنا لیتی ہے۔ پتا یہ چلا کہ جرأت ہی دراصل حصول کامیابی کی ابتدائی ہی نہیں انتہائی شرط بھی ہے مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم اسے جرأت رندانہ کہیں گے یا جسارت فرزانہ...... فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں جسارت فرزانہ کا درجہ جرأت رندانہ سے بہر حال بلند ہے۔

میر صاحب کا ایک شعر سن لیجئے میں تو اسے طنزیہ شعر کہتا ہوں۔ آپ اسے میر صاحب کی ہشیاری یا چالاکی یا استادی تو نہیں کہیں گے۔ اگر کہیں بھی آپ کو اختیار ہے۔ اور اگر یہ ہشیاری ہے تو اس ہشیاری یا چالاکی کا اعتراف کرنا کونسی معمولی بات ہے۔ ہاں تو وہ شعر اس طرح ہے۔

جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی
ناچار میرؔ منڈکری سی مار سو رہا

میں تو پھر بھی کہوں گا کہ میرؔ صاحب سر پٹکتے پٹکتے بیہوش ہو گئے۔ یار لوگوں نے کہدیا کہ میر بیہوش نہیں ہوا تھک کر سو گیا۔ اگر یہ بات ہے تو مجھے کہنے کی اجازت دیجئے۔ میر صاحب تھکے نہیں اور نہ ہی انہوں نے کوئی ہشیاری دکھائی بلکہ یہ ان کی بلا نوشی ہے۔ یہ اور بات کہ رندِ بلانوش پر بھی ایک ایسا وقت آتا ہے کہ وہ سُکر کے عالم میں

چلا جاتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں میر صاحب کی حکمتِ عملی میں کئی عناصر حیات افروز شامل ہیں۔ سب سے بڑا عنصر تو جرأت اور حوصلہ ہے۔ اور پھر اِس کے ساتھ ساتھ احتیاط بھی۔ اور اِسی بڑے عنصر میں وہ عظیم عنصر بھی شامل ہے جس کو آپ بے دریغ میر صاحب کی بلانوشی کہہ سکتے ہیں۔یعنی میر صاحب درد والم کے مقابلے میں نہ صرف ڈٹ کر زندگی گذارنے کے قائل ہیں بلکہ اپنی بلانوشی کو ایک حیات انگیز جی ہاں فکر انگیزی کے ساتھ ساتھ ایک حیات انگیز توانائی بنانا بھی خوب جانتے تھے۔

فن نقاشی پر میر صاحب کی آراء

فن نقاشی پر میر صاحب کی آراء کہیں اور سے نہیں میں اُن کے اشعار سے پیش کر رہا ہوں اور اشعار سے بھی کیا وہ اشعار ہی پیش کر رہا ہوں۔ زیادہ نہیں چند ایک لیکن ان اشعار سے آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ میر صاحب اس فن کے بارے میں کس قدر پروگریسو اور امکانات سے بھرپور خیالات رکھتے تھے۔ دوسرے فنون کی طرح اس فن کی بھی کوئی انتہا نہیں... میر صاحب کے ان دو چار شعروں میں سے پہلے یہ شعر گوش گذار فرمائیے۔

اِن خوبصورتوں کا کچھ لطف کم ہے مجھ پر؟
یک عمر ورنہ اس جا پر یوں ہی کا گذر تھا

اس شعر میں میر صاحب حسین و جمیل لوگوں کا شکریہ ادا کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں یارو ان خوبصورت اور حسین لوگوں کا میں کس طرح شکریہ ادا کروں کہ ان سے پہلے میں اپنے تخیل ہی پر گذارا کرتا تھا۔ بس پریوں کا ذکر ہمارے ہاں رہتا تھا لیکن ان خوبصورت لوگوں نے سامنے آ کر مجھے خالی پھیکی پریوں کی خیالی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا کا نظارہ کرایا۔ میں اِن کا جتنا شکریہ ادا کروں وہ کم ہے کیونکہ ٹھوس اور کنکریٹ اشیاء کو دیکھے بغیر یعنی مابہ التجسم کے دیدار سے لطف اندوز ہوئے بغیر ہم خوبصورتی کا کوئی معقول اور اعلیٰ تصور اپنے ذہن میں لا ہی نہیں سکتے۔ ویسے بھی پریوں کی دنیا میں رہنا بچوں کی دنیا میں رہنے کے مترادف ہے گویا انسان کی بالغ نظری کا دارومدار ٹھوس قسم کے نظاروں سے بہرہ یاب ہوتے رہنے پر ہے۔ اور جیسے ہی ان حسین لوگوں کے

خوبصورت پیکر ہمارے سامنے آتے ہیں ہماری نگاہوں میں تیقّن سے لبریز بینائی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اور ہم حسن کا ایک معیار قائم کرنے میں کامیاب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ حسین اور خوبصورت لوگ ہمارے قریب نہ آتے تو ہم کوئی معقول نقش کیسے بنا سکتے تھے۔ لیکن نقاشی کے لیے یہ مقام کافی نہیں۔ اس مقام پر رک جانے سے فن نقاشی کے محدود ہونے کا خطرہ تھا۔ چنانچہ میر صاحب ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں۔

کیا کیا شکلیں محبوبوں کی پردۂ غیب سے نکلی ہیں
منصف ہو ٹک اے نقاشاں ایسے چہرے بناتے تم؟

اس دوسرے شعر میں فن نقاشی کے ماہرین سے میر صاحب ایک سوال کر رہے ہیں۔ ... دیکھ یارو اگر تم سامنے کے خوبصورت چہروں ہی پر اکتفا کر جاتے اور صرف ان چہروں کی نقاشی ہی سے درجۂ کمال تک پہنچنے کے خواب دیکھنے لگتے تو کس قدر غلط بات تھی اب تمہیں انصاف سے کہو یہ جو ہر روز پردۂ غیب سے اچھی سے اچھی شکلیں نکلتی آ رہی ہیں اس طرح کی شکلیں تم محض اپنے تخیل کے زور پر بنا سکتے تھے؟ میر صاحب نے فن کاروں کو منصف کہہ کر ایک راز کی بات یہ بھی بتا دی کہ اہل فن کبھی غیر منصف نہیں ہو سکتے اور اگر کوئی فن کار منصف نہیں تو سمجھ لو اس کا فن بھی دیرپا اور حقیقی نہیں ہوسکتا۔ منصفی اور انصاف فن کی جان ہے۔

اس کے بعد میر صاحب نے نقاشی کی ایک ضروری شرط کو اپنے تجربے کے طور پر ایک شعر میں بیان فرمایا ہے۔ اس شعر میں بھی میر صاحب نے نقاش کو مخاطب کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ بھئی تم تو نقاشی کرتے ہی رہتے ہو۔ روز طرح طرح کے نقش بناتے ہو لیکن ایک نقش میں نے کھینچا ہے ذرا دیکھو تو سہی یہ نقش کیا ہے؟

نقاش دیکھ تو میں کیا نقش یار کھینچا
اس شوخ کم نما کا نت انتظار کھینچا

اس شعر میں میر صاحب بتا یہ رہے ہیں کہ فن کے لیے فن سیکھنے والے کے تخیل کو بہت تیز اور طرار ہونا بے حد ضروری ہے جس قدر کوئی فن کار اپنے تخیل سے کام لے

گا (اور یہ حوصلے اور صبر کا کام ہے گویا انتظار کرنے کے مترادف) اُسی قدر وہ اپنے فن میں کمال کے درجات حاصل کرتا چلا جائے گا۔ اس شعر میں میر صاحب نے دو باتیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ معشوق جس کی تم تصویر بنانا چاہتے ہو ایسا ہو کہ اس کا دیدار عام نہ ہو۔ ہر وقت تمہارے سامنے نہ آتا رہے بلکہ وہ کم نما، ہو یعنی کبھی کبھی اپنے جلوے دکھاتا ہو اس سے تم اس کے چہرے کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکو گو لیکن اس سے تمہارے فن میں ارتقاء کے امکانات زیادہ واضح ہوں گے۔ دوسری بات اس شعر میں میر صاحب نے یہ بتائی ہے کہ تم میں صبر کا حوصلہ ہو۔ انتظار کرنے کی اہمیت سے تم واقف ہو۔ یہ حوصلہ انتظار تمہارے فن میں پختہ کاری کا ضامن ہوگا۔

میر صاحب نے فن کی اس سے آگے کی منزل کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ایک بڑے گر کی بات ہی نہیں بتائی راہِ فن کے ایک بڑے خطرے سے بھی آگاہ کیا ہے۔ شعر

ہم نہ کہتے تھے کہ نقش اس کا نہیں نقاش سہل
چاند سارا لگ گیا تب نیم رخ صورت ہوئی

جب کوئی فن کار اپنے فن میں قدرے مہارت حاصل کر لیتا ہے تو اس میں ایک غرور کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور غرور بھی یہ کہ اب چونکہ مجھے فن آ گیا ہے تو میں ہر کسی قسم کی صورت بنا سکتا ہوں۔ ہر طرح کا نقش کھینچ سکتا ہوں...... مندرجہ بالا شعر میں میر صاحب اسی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے ایک فن کار سے کہہ رہے ہیں کہ دیکھو پیارے میں تم سے کہہ رہا تھا کہ تم محبوب کا نقش نہیں کھینچ سکتے اس کے خدوخال کو موقلم سے مقید کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن فن کار بزعم نولیش سمجھتا تھا کہ وہ یہ کام کر لے گا۔ لیکن جب اس نے نقش محبوب پر کام شروع کیا تو ظاہر ہے پہلے اس محبوب کا چہرہ ہی بنانا تھا جی ہاں چاند جیسا چہرہ اور جب چاند جیسے چہرے کا نقش بنانا ٹھہرا تو کیوں نہ اس کا مواد چاند ہی سے حاصل کیا جائے لیکن اب جو چاند کی پلیٹ سے موقلم نقاش نے چاند کے رنگ آب و تاب اٹھانے شروع کیے تو ابھی رخ محبوب کا آدھا حصہ یعنی ایک گال

ہی بن پایا تھا کہ پورا چاند صرف ہوگیا۔ اس پر میر صاحب نقاش سے کہہ رہے ہیں کہ میں نہ کہتا تھا کہ تم نقش محبوب کی کبھی تکمیل نہ کرسکو گے۔ یہ کائنات ابھی تک اتنی آسودہ حال اور دولت مند نہیں ہوسکی کہ وہ اپنے سرمایہ سے محبوب کے نقش کی تکمیل کراسکے اور نہ ہی فن نقاشی مہارت کے اس مقام پر پہنچ سکا ہے جہاں وہ اپنے موقلم سے اس کی تکمیل کا اعزاز حاصل کرسکے۔ سارا چاند خرچ ہوگیا اور محبوب کے رخسار کا ایک گال بن سکا۔ ہے نا مزیدار بات؟

ویسے یہ بات نہیں ہے کہ فن نقاشی کی داد نہیں ملتی اور وہ بھی محبوب کی طرف سے۔ اجی جناب محبوب کی طرف سے داد ملتی ہے اور وہ بھی کمال کی داد چنانچہ اس ضمن میں میر صاحب کا ایک شعر سن لیجئے۔

ابھر کر سنگ کے تختے سے پھر دیکھا کیا اُودھر
محبت ہوگئی تھی کوہکن سے نقش شیریں کو

شیریں کو تو محبت کیوں نہ ہوتی جبکہ نقش شیریں کو کوہکن سے ایسی محبت ہوئی کہ ہمیشہ ابھر کر کوہکن ہی کی طرف دیکھتا رہا اور آج تک دیکھتا چلا آرہا ہے۔

سبحان اللہ حُسنِ تعلیل کو استعمال میں لانا کوئی ہمارے میر صاحب سے پوچھے بھی اور سیکھے بھی۔ میر صاحب کے فنِ نقاشی پر اُستاذی ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا مضمون بھی اُن کی کتاب ''نقدِ میر'' میں موجود ہے وہ بھی پڑھ لیجئے۔ اُستاد اور شاگرد کا فرق معلوم ہوجائے گا۔

کاوشِ مژہ

(اور بات ان آنکھوں کی)

خواب ہماری آنکھیں کھولتے ہیں۔ خواب ہمیں ہمارے مستقبل کی خبر دیتے ہیں۔ خواب ہماری ذات کو ہم پر منکشف کرتے ہیں۔ غرض خوابوں کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ لیکن ہمارے میر صاحب نے خواب کے بارے میں ایک بالکل انوکھا انکشاف کیا ہے۔ ویسے خواب کی سب سے کھٹن منزل یہ ہے کہ آدمی خواب تو سوتے جاگتے دیکھتا ہی رہتا ہے۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ یہ خواب تعبیر کی صورت کب اختیار کرتے ہیں۔ ان کی تعبیر کے لیے آدمی کو جو تگ و دو کرنا پڑتی ہے اور اس میں خون پسینہ جو ایک کرنا پڑتا ہے یہاں آ کر خواب بہت پریشان کرتے ہیں اور یوں اکثر اوقات آدمی اپنے اچھے سے اچھے خواب کو بلی کے خوابوں سے تعبیر کر کے اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہ روز کا معمول ہے کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ میر صاحب کا نظریہ خواب ان سب نظریات سے مختلف ہے بلکہ اس کو ہم نظریہ کیا کہیں ایک حقیقت اور ایک واقعہ کا نام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ میر صاحب نے خواب دیکھا۔

رات اس کی چشم میگوں خواب میں دیکھی تو میں
صبح سوتے سے اٹھا تو سامنے پیمانہ تھا

ملاحظہ فرمایا خواب دیکھنے کا لطف تو یہ ہے کہ اُدھر آپ نے خواب دیکھا اِدھر

آپ کے سامنے اس کی تعبیر چھم سے اور دھم سے حاضر ہو گئی۔ دراصل میر صاحب اپنے اس شعر میں ہمیں بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اگر آپ واقعی خلوص چشم اور خلوص قلب سے خواب دیکھیں تو ایسے خواب کی تعبیر میں دیر نہیں لگتی۔ یہ خواب اور اس کی تعبیر آپ پر ایک ساتھ نازل ہوتے ہیں۔ بلکہ ایسے خواب اور ان کی تعبیریں کوئی مختلف چیزیں نہیں ہوا کرتے۔ ابھی ابھی جو میں نے خواب دیکھنے کے ضمن میں خلوص قلب کے ساتھ چشم کی بات کی ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ خلوص چشم کے ذریعہ آدمی خواب اور اس کی تعبیر کے درمیان کے عرصے اور فاصلے کو پیمائش کر کے باہمت اور مطمئن رہتا ہے۔ بھئی آپ نے خواب ہی ایسے کیوں نہیں دیکھے جن کو تعبیر میں لانا آپ کے اپنے قبضہ قدرت میں ہے...... آدمی کا کوئی خواب ایسا نہیں ہوتا جو شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔ بس اپنے اس شعر میں جو میر صاحب نے اپنے محبوب کی آنکھوں کا خواب دیکھا تو ان کے یعنی میر صاحب کے جاگنے سے پہلے اس کی تعبیر ان کے سامنے رکھی تھی۔ شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ آپ جس قدر لطیف کوئی خواب دیکھتے ہیں اسی لطافت کے پیش نظر اس لطیف خواب کی تعبیر آپ کے نزدیک ہوتی ہے۔

اور پھر اس تمام حقیقت کے باوجود اس تمام خواب اور تعبیر کے ایک ہونے کے باوصف اس خواب آگیں حقیقت سے بھی تو انکار نہیں کر سکتے کہ ہر چشم میگوں جس کی بات میر صاحب نے ابھی ابھی اپنے ایک شعر میں کی ہے جی ہاں یہ چشم میگوں اپنے جادو سے حقیقت کو خواب اور خواب کو حقیقت بنا کر دکھانے میں بھی تو کمال کرتی ہے...... اور پھر جادو بھی کوئی ایک ہوتا ہے پے در پے ایک سے ایک نیا جادو یہ آنکھ دکھاتی ہے۔ جبھی تو میر صاحب نے اپنے ایک شعر میں آخر گھبرا کر یہ اعلان کر ڈالا۔

ایک دو ہوں تو سحر چشم کہوں
کارخانہ ہے وہ تو جادو کا

ایک اور مزے کی بات سنیئے میر صاحب دیکھ کر تو آئے اپنے محبوب کی آنکھیں اور ان آنکھوں کے زیر اثر مست ہو کر اور بقعۂ نور بن کر بیماروں کیطرح گھر

میں لیٹ گئے۔ گھر والے بھی اور عیادت کرنے والے بھی حیران تھے کہ یہ بھی خوب کوئی مستی بھری اور نورانی بیماری ہے۔ کہ میر صاحب بیمار بھی نہیں مست بھی نہیں اور بقعۂ نور بھی بنے پڑے ہیں۔ اس پر میر صاحب لوگوں کو یا گھر والوں کو تو اپنے دل کی بات کیا بتاتے خود اپنے آپ سے کہہ رہے ہیں۔

ان آنکھوں کے بیمار ہیں میرؔ ہم
بجا دیکھنے ہم کو آتے ہیں لوگ

اس شعر میں ایک بہت لطیف نکتہ یہ ہے کہ لوگ ہمیں دیکھنے آتے ہیں تو چونکہ ہم اپنے محبوب کی آنکھوں کے بیمار ہیں اس لیے لوگوں کی بھی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اگر وہ ہماری بیمار پرسی کو عیادت کو آ رہے ہیں تو اس کا جیتا جاگتا ثبوت مع ثواب انہیں بھی تو یہ مل رہا ہے کہ ان کی آنکھوں کے نور میں اور اُنکی بینائی میں حیرت انگیز قسم کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس شعر میں اردو غزل کی س روایت کا بھی تو خیال رکھا گیا ہے کہ خوبصورت آنکھیں بیمار ہوتی ہیں ایسی بیمار جو دیکھنے والوں کو صحت اور تندرستی و شادابی کے ساغر پر ساغر پلاتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں میر صاحب سمیت ہمارے جو کلاسیکی شعرا نے چشم آدم کی تعریف کی ہے وہ بھی ایک طرح سے محبوب کی آنکھوں کے حوالے ہی سے کی ہے مطلب یہ ہے کہ جب معشوق کی آنکھیں ایسی ہیں اور نجانے کیسی کیسی ہیں تو پھر عاشقوں کی آنکھیں کیسی کیسی نہ ہوں گی۔ چنانچہ میر صاحب کا ایک شعر ہے۔

چشم ہو تو آئنہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

مطلب یہ ہے کہ آدمی کی آنکھ ہو اور ایسی آنکھ ہو جیسا کہ ہونے کا حق ہے تو پھر تمام دنیا آئینہ خانہ بن جاتی ہے اور پھر اس کی دیواروں میں بھی آدمی کو اپنا چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔ وہی بات کہ جو آنکھ اپنے محبوب کا چہرہ دیکھ لیتی ہے پھر اس میں ہر طرح کی بینائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی چشم آدم کے حوالے سے میر صاحب کا ایک اور شعر

سینئے ......فرماتے ہیں۔

اگر چشم ہے تو وہی عین حق ہے
تعصب تجھے ہے عجب ماسوا سے

اے بنی نوع آدم اے انسان اگر تیرے آنکھ ہے جیسا کہ آنکھ کو ہونا چاہئے تو پھر یوں سمجھ کہ وہی حق کی آنکھ ہے۔ اب آپ عین حق کو حق کی آنکھ اور اسے اصل اور سچی آنکھ بھی کہہ سکتے ہیں جس میں بہت کچھ دیکھنے کی توانائی ہوتی ہے۔ اس پر شاعر حیرانی کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ اے انسان اگر تو واقعی دیدۂ بینا رکھتا ہے تو پھر تو ماسوا بھی اللہ کے علاوہ دوسری اشیاء کو ان کی اپنی اہمیت اور وقعت سے کیوں نہیں دیکھتا یہ تو ان کا حق ہے۔ آخر اس طرح کا یہ تعصب تجھ میں کہاں سے آ گیا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ آدمی کے پاس دیدۂ بینا یعنی دیکھنے والی آنکھ بھی ہو اور پھر بھی کوئی شے اُسے صاف اور واضح نظر نہ آئے اور یوں وہ کسی نہ کسی تعصب کا شکار رہے۔ حالانکہ اپنے دیدۂ بینا کے ہوتے ہوئے اُسے اس طرح کسی تعصب کی پھندے میں آنا ہی نہیں چاہئے۔

میر صاحب کا ایک اور شعر ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ عشق کے لیے ضروری چیزیں یہ ہیں ایک تو اسکے پاس صبر اور حوصلہ ہو دوسرے اسکے حواس بجا ہونے چاہئیں اور تیسری بات یہ ہے کہ عاشق صاحب کے پاس دانش بھی ہو۔ شعر یہ ہے۔

صبر و حواس و دانش سب عشق کے زبوں ہیں
میں کاوش مژہ سے عالم کو چھان مارا

آپ نے ملاحظہ فرمایا میر صاحب تو یہ کہہ رہے ہیں کہ لوگوں کو جو عشق کے تجربے میں عزت اور وقار حاصل نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کے عاشقوں میں نہ صبر ہے نہ اُن کے حواس قائم رہتے ہیں اور نہ ہی وہ عقل و دانش رکھتے ہیں اور میر صاحب یہ الزام اس وقت لگا رہے ہیں جب انہوں نے نہایت باریکی سے عشق کے بارے میں یہ چھان پھٹک کی ہے۔ کاوش مژہ سے یعنی اپنی پلکوں کے چھلنی سے ساری دنیا کو چھانا ہے تب جا کر یہ نتیجہ نکالا ہے۔ مراد یہ ہے کہ عاشقی کے بارے میں چھان

پھٹک کرنا بہت ہی نازک کام ہے اور میر صاحب نے اس نزاکت کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ مگر زیر بحث شعر سے جہاں ہمیں میر صاحب کے بارے میں یہ پتا چلتا ہے کہ میر صاحب تحقیق کے میدان میں بہت احتیاط سے کام لینے کے قائل ہیں اور تحقیق کے نزاکتوں اور لطافتوں سے وہ آشنا ہیں وہاں ہمیں میر صاحب کے نظریۂ عشق سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں یہی سمجھا جاتا ہے کہ عاشقی میں نرے جذبات ہی جذبات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ بس لوگ آنکھیں بند کر کے عاشق ہو جاتے ہیں۔ جبکہ میر صاحب کا کہنا ہے کہ عاشق کے لیے تین کڑی شرطیں ہیں۔ اوّل صبر یعنی مسلسل ڈٹ جانے کی قوت اور طاقت دوسرے اپنے اوسان اور اپنے حواس قائم رکھنا۔ اور تیسری کڑی شرط دانش کی ہے۔ جس شخص کے پاس دانش نہیں سمجھ لیجئے اس کے پاس عشق بھی نہیں ہوسکتا۔ عاشقی کوئی اندھیرے میں چھلانگ لگانے والی بات نہیں آجکل چونکہ لوگوں میں ان تین چیزوں یعنی صبر، حواس اور دانش کا فقدان ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ آجکل لوگ اپنی ان فطری صلاحیتوں سے کام نہیں لیتے تو انہیں عشق جیسا اعلیٰ انسانی تجربہ بھی نصیب نہیں ہوسکتا۔

لیکن میر صاحب کا ایک اور شعر ہے جو ہم پر یہ عظیم حقیقت آشکار کر رہا ہے کہ عاشقی میں لوگ تساہل اور تغافل سے کام لے کر اس عمدہ اور اعلیٰ انسانی تجربے کو اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں مگر حسن کی طرف سے اس طرح کا تساہل اور تغافل عمل میں نہیں آتا حسن کو تو جہاں بھی کسی عشق میں اس طرح کا خلوص اور یہ جملہ صفات نظر آتی ہیں وہ اپنی خدمات پیش کر دیتا ہے۔ میر صاحب کا شعر ہے۔

پلکوں سے رفو اُن نے کیا چاک دل میرؔ
کس زخم کو کس نازکی کے ساتھ سیا ہے

ہمیں میر صاحب کی غزل میں حسن کی جانب سے اس طرح کے الطاف و اکرام کی مثالیں اکثر نظر آتی ہیں۔ اور یہ بھی میر صاحب کے شاعرانہ کردار کے مضبوط و محکم اور قوی و جری ہونے کی دلیل روشن ہے۔

حُسن کی جانب سے احتیاط کی یہ مثال کس قدر عشق افروز اور حُسن افزا ہے اِس نزاکت اور باریکی کو ایک عاشق کا دل ہی سمجھ سکتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ محبوب کی پلکیں زخم بھی لگاتی ہیں اور پھر ان زخموں کو رفو بھی کرتی ہیں۔ اور پھر دل کے چاک کو یعنی دل کے زخم کو نازکی کے ساتھ پلکوں کے علاوہ اور کوئی دوسرا کس طرح رفو کر سکتا تھا۔

مسیحا کو جینا مشکل ہوگیا

یہ کسی دوسرے کا قول نہیں خود میر صاحب نے اپنے ایک شعر میں کچھ اس طرح کی بات کی ہے لیکن اگر مسیحا کو جینا مشکل ہوگیا تو کیوں؟...... مسیحا تو خود لوگوں کو صحت یاب کرتا تھا اور صرف اتنی سی بات نہیں وہ تو اللہ کے حکم سے مردوں کو بھی زندہ کر دیتا تھا۔ لیکن ذرا ٹھہریئے یہ بھی تاریخ کی حقیقت ہے کہ ان جملہ خوبیوں کے باوجود لوگوں نے مسیحا کو صلیب پر چڑھا دیا تھا۔ کہیں میر صاحب کا اشارہ اس طرف تو نہیں ہے۔ ہرگز نہیں میر صاحب اپنے شعر میں اس طرح کی عام سی بات کیسے کہہ سکتے تھے۔ وہ تو اپنے اس شعر میں اپنے محبوب کے ہونٹوں کی تعریف کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے میر صاحب نے اپنے محبوب کے ہونٹوں کی تعریف میں اور بھی شعر کہے ہیں۔ مثلاً بہت ہی مشہور شعر ہے۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اب اس شعر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس شعر میں جو تشبیہ "پنکھڑی اک گلاب کی سی" ہے کہہ کر محبوب کے لب کی تعریف کی ہے اس تشبیہ نے ہمارے جملہ پانچوں حواس کا احاطہ کرلیا ہے۔ کیا قوت شامہ باصرہ کیا لامسہ کیا ذائقہ اور کیا سامعہ...... سامعہ کیسے؟ وہ ایسے کہ کلی جب چٹکتی ہے تو اس وقت بھی ایک بے حد لطیف قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میر صاحب کا ایک اور شعر ہے جس کے مضمون کو جس کے خیال کو ہمارے فیض احمد فیض نے جوں کا توں اپنی ایک غزل میں منتقل کرلیا...... پہلے

میر صاحب کا وہ شعر سن لیجئے۔

یاقوت کوئی اس کو کہے ہے کوئی گل برگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

اب فیض احمد فیض کا بھی شعر ملاحظہ فرمالیجئے۔

اگر شرر ہے تو بھڑکے جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگ لب سے ہے

اب یہ آپ خود فیصلہ کریں کہ فیض صاحب نے میر صاحب سے کس قدر فیض اٹھایا ہے۔ ویسے خیال اور مضمون میر صاحب ہی کا ہے۔ لیکن میر صاحب کے جس شعر کے بارے میں ہم بات کر رہے ہیں اس کا مضمون اور خیال دونوں ہی اچھوتے ہیں۔ پہلے میر صاحب کا وہ شعر ملاحظہ فرمالیجئے۔

میر کیا بات اس کے ہونٹوں کی
جینا دوبھر ہوا مسیحا پر

جس طرح میر صاحب کے محبوب کے ہونٹ بے حد سخاوت کے ساتھ اور لطافت ونزاکت کے ساتھ لوگوں کو صحت خوشحالی اور زندگی کی دولت سے مالا مال کر رہے ہیں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اور پھر مسیحا تو صرف طبیب ہی نہیں پیغمبر بھی تھے انہیں تو جو کچھ بھی کرنا ہوتا مرضی معبود کے مطابق کرنا تھا۔ ادھر میر صاحب کا محبوب نہ طبیب اور نہ کوئی پیغمبر وہ تو بنی نوع آدم ہی میں سے ایک شخص ہے جس کے ہونٹوں میں قدرت نے بلا کی تاثیر بھر دی ہے۔ ایسی صورت حال میں مسیحا کے لیے جینا دوبھر نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ محبوب کے ہونٹوں نے جی اٹھنے کے صحت یاب ہونے کے، شاد آباد رہنے کے معیار ہی بدل دیئے ہیں۔ محبوب کے ہونٹوں سے پھوٹتے ہوئے زندگی کے دھارے کچھ اپنی ہی کیفیت رکھتے ہیں جن سے مسیحا کے ہونٹ اس طرح کا تعلق نہیں رکھتے محبوب کے ہونٹوں کی تعریف اس گہرائی اس انہماک اس معنی خیز انداز سے پہلے کہاں ہوئی۔ کم از کم مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ مسیحا کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ آن

پڑی ہے کہ وہ محبوب کے ہونٹوں کی طرح لوگوں کو زندگی اور اس کی سرمستی سے بہرہ مند نہیں کر سکتے۔ محبوب کے ہونٹوں پر آ کر، محبوب کے ہونٹوں سے پھوٹ کر زندگی اپنے معنی ہی بدلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مسیحا لوگوں کو اپنے ہونٹوں سے جو زندگی بخشتے وہ محض زندگی ہوتی محبوب کے ہونٹ لوگوں کو زندگی کے علاوہ بھی اور بہت کچھ دیتے ہیں جو مسیحا نہیں دے سکتے۔ سو باتوں کی ایک بات محبوب کے ہونٹوں نے مسیحا کے لیے طرح طرح کے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں جن سے بیک وقت عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔

عالم حیرت......عالم حمد و ثناء

ہوا یوں کہ چمن میں آب جو کے کنارے گل نے بہتے ہوئے پانی میں اپنا عکس دیکھا تو وہ حیران رہ گیا ''ارے میں اس قدر خوبصورت ہوں۔'' گل کی اس حیرت کو بہتے ہوئے آب جو نے نظارہ کیا تو وہ ٹھٹکا یعنی ایک لمحے کو رک گیا ''اُف اس قدر خوبصورت گل کا عکس میرے پانی میں پڑ رہا ہے گویا یہ خوبصورتی یہ حسن و جمال میری آغوش میں ہے میری تحویل میں ہے۔ میں چمن کا ایک معمولی سا آب جو اس قدر حسن و جمال کی دولت کا مالک ہوں۔ بس آب جو کو یہ خیال کیا آیا وہ وہی کا وہی ٹھہر کر رہ گیا۔ اس کا ایک لمحے سے بھی لاکھوں کروڑں گنا کم وقفے میں ٹھٹکنا رکنا جاوداں ہو گیا اب وہ بہہ بھی رہا ہے بہنے کی کوشش بھی کر رہا ہے لیکن وہیں کا وہیں رکا کھڑا ہے۔ اس کے ٹھٹکنے کا یہ عالم ایک عظیم حیرت کے عالم میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اب پوری کائنات پر عالم حیرت کا یہ لمحہ چھایا ہوا ہے۔ میر صاحب نے اس عالم حیرت کو اپنے شعر میں یوں قلم بند کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

حیرت گل سے آب جو ٹھٹکا
بہے بہتیرا پر بہا بھی جائے

مجھے اپنی کم مائگیٔ مطالعہ کا اعتراف ہے۔ ممکن ہے کسی دوسرے اردو فارسی کے شاعر نے میر صاحب سے پہلے اس خیال کو اس طرح اپنے کسی شعر میں بیان کیا ہو مگر میری نظر سے نہیں گذرا۔ ساری کائنات کے عالم حیرت کو کس کمالِ بلاغت کے ساتھ ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ سوچیئے تو سہی تمام کائنات عالم حیرت میں اپنی جگہ ٹھہری ہوئی

بھی ہے۔ اور چل بھی رہی ہے۔ سفر حیرت جاری بھی ہے اور رکا ہوا بھی ہے۔ سفر جاری ہے تعمیل حکم کے طور پر اور سفر رکا ہوا ہے شکر کے طور پر.......... حکم کس کا؟ حقیقت عظمیٰ کا...... حیرت کس کی؟ تمام کائنات کی۔ کائنات کے ایک ایک ذرے کی...... وہی بات کہ شکر کے طور پر...... حمد وثناء کے طور پر...... عالم حیرت سے بڑھکر آدمی شکر اور کس طرح ادا کرسکتا ہے؟ اِسی طرح عالم حیرت سے بڑھ کر حمد وثناء اور کس طرح کی جاسکتی ہے......؟ اور ہمارے پاس حمد وثناء کے لیے اثاثہ بھی کیا ہے...... چند الفاظ چند خاموشی کے لمحے...... شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع میں تو وقت کا بڑے سے بڑا فلسفہ سما گیا ہے .... بہے بہترا پر بہا بھی جائے...... ہم کہاں رکے کھڑے ہیں اور کہاں چل رہے ہیں۔ اسی طرح کب چل رہے ہیں اور کب رُکے کھڑے ہیں...... زمان ومکاں کی ساری صورتیں سارے ہنگامے سارے نشیب وفراز سارے طلوع وغروب یوں لگتا ہے اس ایک مصرع میں آکر جمع ہوگئے ہیں......اور حیرت اپنی جگہ، گل اپنی جگہ آب جو اپنی جگہ یہ سب کے سب ہمیں لازوال دعوتِ فکر وعمل سے سرفراز کرنے میں مصروف بھی ہیں اور سراپا دعا بھی.......... وہی بات کہ عالم حیرت کا اس سے عمدہ مرقع میری نظر سے نہیں گذرا.......... ہمارے دوست، ڈاکٹر سلیم اختر یہ شعر بہت پڑھا کرتے ہیں سو یہ چند الفاظ ان کے نام..........

میر صاحب بہ حیثیت استاد

مجھے اس وقت میر صاحب کا یہ شعر یاد آ رہا ہے

میرے سنگ مزار پر فرہاد
رکھ کے تیشہ کہے ہے "یا استاذ"

آپ جانتے ہیں میر صاحب تعلّی کرتے ہیں اور بڑے کھل ڈل کر بغیر کسی تکلف کے اور پھر یہ تعلّی ایک طرح کی نہیں ہوتی کہ آپ اس کی یکسانیت سے اکتا جائیں۔ میر صاحب آپ کو اپنے آپ سے متعارف کراتے ہیں اور بڑے نئے نئے طریقوں سے جس کی باعث آپ کے دل میں ان سے یعنی میر صاحب سے محبت بڑھتی ہے۔ اور جتنا جتنا آپ میر صاحب کو سمجھتے ہیں آپ اسی نسبت سے ان سے محبت بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ میر صاحب سے محبت کا یہ سفر بھی بہت ہی دلچسپ قسم کی چیز ہے۔ جی ہاں ان کی تعلیٰ کے ساتھ دلچسپ سفر............

بہر حال شعر زیر بحث میں میر صاحب نے تعلیٰ کی ہے مگر بہت ہی دل کش انداز میں۔ اس طرح یہ انداز انوکھا بھی ہے۔ پہلی بات تو اس شعر کی تعلّی میں انوکھی بات یہ ہے کہ قبلہ میر صاحب نے اپنے آپ کو مرحوم و مغفور تصور کر کے یعنی مرا ہوا تسلیم کر کے تعلّی کو ایک طرح سے عاجزی اور انکسار کی صورت سے ہمکنار کر دیا۔ آپ بے خوف ہو کر میر صاحب اپنے بارے میں چاہے کتنے بھی زمین آسمان کے قلابے ملائیں برا نہیں لگے گا۔ بے چارے میر صاحب کا انتقال جو ہو گیا انہوں نے رحلت فرمالی۔ شعر کی پوری تعمیر Constraction کے پیش نظر حفظ ما تقدم کے طور پر میر صاحب

نے اپنے مزار پر سنگ یعنی ایک عدد پتھر بھی رکھوا دیا یا لگا دیا............اس کے بعد تھکا ہارا روز کے کام کرنے کے بعد یعنی پہاڑ کاٹنے کے بعد فرہاد میر صاحب کے مزار پر آتا ہے اور اس مزار کے پتھر پر اپنا تیشہ رکھ کر بس ایک آواز لگاتا ہے ''یا استاد'' ......اور اس ایک صدا ''یا استاد'' کے ساتھ شعر گویا اپنی بلاغت کے کمال پر پہنچ جاتا ہے۔ میرے سنگ مزار پر فرہاد... رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد......بس یوں سمجھئے اس ''یا استاد'' کے ساتھ افہام وتفہیم کے طرح طرح کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور دروازے بھی کیا سچ پوچھئے تو آبشار گرنے لگتے ہیں۔ جی ہاں معانی کی چھما چھم سے قاری ہر لمحے ایک نیا غسل لیتا ہے۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ فرہاد نے تو ایک بے ستوں پہاڑ ہی کاٹا تھا اور پہاڑ بھی کیا اس کا ایک حصہ جہاں سے وہ پانی لے کر آیا تھا......میر صاحب نے معلوم نہیں آلام ومصائب کے کتنے پہاڑ کاٹے اور وہ بھی کچھ عرصے کے لیے نہیں۔ میر صاحب تو یہ کام عمر بھر کرتے رہے۔ اس کے علاوہ نکتے کی بات یہ ہے کہ عام پہاڑ کاٹنے کتنے بھی دشوار کیوں نہ ہوں آلام ومصائب کا ایک پہاڑ کاٹنا بھی اس قدر مشکل کام ہے جس کا اندازہ کچھ وہی شخص لگا سکتا ہے جس کو کبھی اس کا تجربہ ہوا ہو۔ اللہ ہمیں اپنے حفظ وامان میں رکھے آمین۔ لیکن میر صاحب کی جگر داری حوصلہ اور ہمت دیکھئے نہ صرف وہ آلام و مصائب کے پہاڑ کاٹتے رہے ان پہاڑوں کے کاٹنے کو انہوں نے اپنا ہنر بنا لیا۔ وہ اپنے کسی بھی غم کے پہاڑ کو بارود سے نہیں اڑاتے تھے۔ وہ تو غم کے اس پہاڑ کے ایک ایک پتھر کو بڑے پیار کے ساتھ اپنے تیشے سے پہاڑ کے پہلو میں گدگدی کر کے جدا کرتے اور پھر اپنے اسی تیشہ ہنر سے اس ٹکڑے کو کوئی بہت ہی خوبصورت سی شکل دے کر جی ہاں اپنے کسی خواب کی شکل دے کر اسے اپنے سینے کے نگار خانے میں رکھ دیتے یہی تو وہ سلیقہ تھا جس کے بارے میں میر صاحب نے بڑے واضح انداز میں کہا ہے ..
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں میر صاحب کی شاعری میں سلیقہ کا لفظ ہزار طرح کی فراست وخردمندی سے لبریز ہے۔ دیکھئے نا جو شخص جنوں بھی شعور کے ساتھ کرنے کا

قائل ہو آپ اس کے ''سلیقہ'' کے قائل کیسے نہ ہوں گے۔

خوش ہیں دیوانگیِ میر سے سب
کیا جنون کر گیا شعور سے وہ

مطلب یہ ہے کہ میر نے بیک وقت اپنے جنوں اور اپنے شعور سے لوگوں کو متاثر کیا ہے اور ان سے داد بھی وصول کی ہے۔

اس کے علاوہ میر صاحب کے شعر زیر بحث میں جیسا کہ میں پہلے اشارۃً عرض کر چکا ہوں ''سنگ مزار'' بھی بہت سے معانی کا حامل ہے۔ میر صاحب کے مزار کا یہ پتھر اس بات کی علامت ہے کہ انسان کے لیے آلام و مصائب پتھروں کا یعنی ان مشکلات کا کبھی خاتمہ نہیں ہوتا۔ یہ مشکلات کے پتھر انسان کے لیے ہمیشہ موجود رہتے ہیں...... میر صاحب کے مزار کا یہ پتھر اس بات کی علامت ہے کہ انسان کے لیے آلام و مصائب کے پتھروں کا یعنی ان مشکلات کا کبھی خاتمہ نہیں ہوتا یہ مشکلات کے پتھر انسان کے لیے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ میر صاحب کے مزار کا پتھر ہمیں بتا رہا ہے کہ اگر اس پتھر پر میر تقی میر کا نام لکھا گیا ہے تو اس کا مطلب اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ میر تقی میر اپنی زندگی میں طرح طرح کے پتھروں سے نمٹتا رہا اب آنے والوں کی باری ہے کہ وہ کچھ کر کے دکھائیں۔ اور میر تقی میؔر سے بڑھ چڑھ کر کچھ کر کے دکھائیں۔ ہوسکتا ہے کہ آنے والے لوگوں کے لیے ان پتھروں کو اپنے راستے سے ہٹانا کوئی اتنا دشوار کام نہ ہو جیسا میر صاحب کے وقت میں تھا۔ لیکن خواہ کیسا عمدہ زمانہ بھی کیوں نہ آجائے پتھروں سے واسطہ تو پڑے گا۔ ان پتھروں سے ہم غافل نہیں ہوسکتے اور نہ ہمیں ایسا کبھی سوچنا چاہئے۔

فرہاد کا میر صاحب کے سنگ مزار پر تیشے کو رکھ کر ''یا استادؒ'' کہنا ایک طرح فرہاد کی طرف سے میر صاحب کی ہنروری کی ایک بھرپور داد ہے۔ یا استاد کہہ کر فرہاد اس حقیقت کو تسلیم کر رہا ہے کہ ایک تو نری خاراشگافی ہی خاصا جان جوکھم کا کام ہے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ عاشقی کی ذمہ داریوں کو بھی نبھانا۔ یا میر صاحب یہ آپ ایسے استاد

ہی کا کام تھا۔ ہماری طرف سے تو چیں بولی جا رہی ہے۔ یا ہم تو چیں بول گئے۔ اب آپ کو یاد کر کے اگر ہم میں کوئی حوصلہ پیدا ہوتا ہے تو یہ دوسری بات ہے۔

مزید یہ کہ فرہاد کو اپنی عاشقی کے محدود ہونے کا بھی احساس ہے۔ جبکہ میر صاحب جب تک جیتے رہے نہ صرف درد والم کے پہاڑ کاٹتے رہے بلکہ ان پہاڑوں کے پتھروں کو کام میں بھی لاتے رہے۔ وہی بات کہ جب میر صاحب نے خود فرمایا ہے۔ ''تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا۔'' ادھر فرہاد کے حوصلہ کی تو اتنی سی بات ہے کہ بڑھیا نے اسے جھوٹ موٹ کہدیا کہ شیریں مر گئی اور فرہاد نے کچھ سوچے سمجھے بغیر تیشے کو اپنے سر میں مارا اور مر گیا...... اس کے مقابلے میں میر صاحب نے ایک لمحہ کے لیے بھی درد و آلام میں گھرے رہنے کے باوجود غور و فکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا...... میر صاحب اپنے آپ کو یونہی بلانوش نہیں کہتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ واقعی بلانوش تھے کہ آگے بڑھ کر ہر آنے والے غم کو ایک گھونٹ کے ساتھ اپنی ذات میں جذب کر لیتے۔

چمن ساز کوچہ محبوب

سچ پوچھیے تو میر صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہی کیا کم ہے کہ انہوں نے اپنی ذات سے اپنے محبوب کی گلی کو ہمیشہ گل وگلزار بنائے رکھا۔سوسوطرح کے اس میں پھول کھلاتے رہے۔سوسوطرح کی اس میں بہاریں لاتے رہے۔کونسا رنگ کونسی خوشبو ایسی ہے جو میر صاحب کے محبوب کی گلی سے طلوع ہوکر ابھر کر بکھر کر ساری دنیا کو رنگین اور مشکبار نہ کرتی رہی ہو......میر صاحب کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

برسوں تری گلی میں چمن ساز جو رہا
سو دیدہ اب گداختہ ہو کر شفق ہوا

دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ میر صاحب اپنے محبوب کی گلی میں چمن سازی کیا کرتے رہے ساری دنیا کو حسن و جمال کی دولت سے سرسبز و شاداب کرتے رہے۔خیر وخوبی کی قدروں کو فروغ دینا میر صاحب نے اپنے لیے ایک فریضہ قرار دے رکھا تھا۔سو اس کار جمال وجلال کے لیے انہوں نے کبھی اپنی جان کی پرواہ نہیں کی۔حسن و جمالِ زندگی سے لوگوں کی زندگیوں کو لبریز کرنے یا لبریز رکھنے کی کوشش میں مصروف رہنا کوئی معمولی کام یا معمولی مصروفیت نہیں۔اس کے لیے اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر میدان عمل میں اترنا پڑتا ہے۔ہر رنگ اپنے فروغ کے لیے آپ کے خون کا نذرانہ مانگتا ہے۔اسی طرح ہر خوشبو کو عام کرنے کے لیے آپ کو اپنی روح کے خزانوں کے سب دروازے کھولنے پڑتے ہیں۔اس کام کے لیے انسان کا سخی وکریم ہونا بے حد ضروری ہے۔اسی لیے میر صاحب نے تمام عمر اپنے خون کی سبیل لگائے رکھی

اور محبوب کی گلی سے کسی کو پیاسا نہیں جانے دیا۔

دیکھ لیجئے میں نے میر صاحب کے محبوب کی گلی میں میر صاحب ہی کے ہاتھوں چمن سازی کی تشریح کرنے میں اتنے الفاظ صرف کیے جبکہ میر صاحب نے شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع میں چند لفظوں کے ساتھ اپنی بات کو واضع کر دیا۔ چنانچہ میر صاحب فرماتے ہیں اے محبوب میں نے چونکہ تری گلی کی چمن سازی برسوں کی، سو اس کے نتیجے میں آج میری آنکھ پگھل کر گداختہ ہو کر شفق کی صورت میں سارے آفاق پر نمایاں ہو گئی ہے۔ سو دیدہ اب گداختہ ہو کر شفق ہوا۔ یہاں ایک معمولی سے لفظ اب نے چمن سازی کے تمام عرصے کو سمیٹ کر کس خوبصورتی سے شفق کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے کہ ہمیں صاف پتا چل رہا ہے کہ میر صاحب کو اس چمن سازی کے لیے کیا کیا خون کے آنسو رونے پڑے ہیں۔ گریہ و زاری کے کیسے کیسے تجربات ان پر وارد ہوتے رہے ہیں تب کہیں جا کر محبوب کی گلی میں بہاروں کا طوفان برپا ہوا۔ ایسے عالم میں آخر اس دیدۂ پر خون کو پگھل کر شفق تو ہو جانا تھا۔ مگر یہاں بھی میر صاحب نے کیا خوب ایک نکتہ بیان فرما دیا ہے کہ شفق کا رنگ خون کا رنگ ہوتا ہے اور خون علامت ہے زندگی کی۔ تو گویا میر صاحب نے محبوب کی گلی کی چمن سازی کا اعلان جو شفق کی صورت میں کیا ہے۔ تو وہ بھی زندگی سے بھرپور اعلان کی صورت رکھتا ہے۔ یعنی محبوب کی گلی کے صدقے میں فضاء شفق کیا چھائی ہے یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ محبوب کی گلی پر زندگی اپنا بھرپور سایہ کیے ہوئے ہے۔

دل کا نظم و نسق

ایک شعر سنیئے جی ہاں میر صاحب کا ایک شعر جس میں انہوں نے نفسیات انسانی کے ایک بہت بڑے راز کو منکشف کیا ہے۔ یہ راز ایک بہت بڑا راز اس لیے ہے کہ اگر ہم اس کو اچھی طرح سمجھ لیں تو ہماری زندگی بے شمار کامیابیوں سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ ہاں تو وہ شعر یہ ہے۔

دل میں رہا نہ کچھ تو کیا ہم نے ضبطِ شوق
یہ شہر جب تمام لٹا تب نسق ہوا

آپ جانتے ہیں دل کی کامیابی اور دل کی زندگی یعنی اسے زندہ رکھنے کا راز اس میں ہے کہ آپ اپنے دل کے شوق پورے کرتے رہیں۔ مگر دل کے شوق پورے کرنا کوئی آسان کام ہے......؟ جی ہاں میر صاحب یہی تو بتا رہے ہیں کہ دل کے شوق پورے کرنا ایسا کوئی مشکل کام نہیں بس ہمیں اس کے لیے ذرا سی ہمت دکھانی پڑتی ہے اور وہ ہمت یہ ہے کہ قدرت نے ہمیں اپنے جذبات پر قابو پانے یا جذبات کو قابو میں رکھنے کی جو طاقت عطا فرمائی ہے ہم اس سے کام لیں یعنی اپنے اختیار کو عمل میں لائیں اور وہ اس طرح کہ ہم اپنے جذبہ شوق کے منہ میں لگام دیں اس کو ضابطے میں رکھیں یہ تو غالباً بہت واضح بات ہے کہ جذبۂ شوق کے منہ میں لگام دینے سے شوق مرتا نہیں بلکہ شوق کو اپنی تکمیل کی راہیں نظر آنے لگتی ہیں۔ مگر عموماً ہوتا یہ ہے کہ اپنے شوق کو نظم و ضبط میں رکھنے کے بجائے آدمی اس کو بے لگام چھوڑ دیتا ہے جس سے شوق کو تو پھر بھی کچھ نہیں ہوتا یعنی شوق کا تو پھر بھی خاتمہ نہیں ہوتا البتہ اس فضول خرچی میں دل کی دولت لٹ جاتی ہے۔ لیکن اس منزل پر آ کر بھی میر صاحب آدمی کو مایوس نہیں کرتے ان کا کہنا

یہ ہے کہ سب کچھ لٹ لٹا کر بھی دل میں امکانات کی اس قدر دولت موجود ہوتی ہے کہ اگر آدمی ایسی صورت میں اپنے شوق کو اپنے قابو میں کر لے تو دل دوبارہ سنبھل جاتا ہے پھر سے آباد ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ گویا ضبط شوق میں شہر دل کے شاد و آباد ہونے کا راز ہے۔ عموماً آدمی ایسے عالم میں جب اس کے شوق کی بے راہروی کے باعث اس کا دل برباد ہو جاتا ہے تو دل کے امکانات یعنی دل کی امکانی لامحدود قوت کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ آدمی کو دل کے لٹنے سے فکر مند تو ضرور ہونا چاہئے لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ نہیں رہنا چاہئے۔ جد و جہد اور تگ و دو کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے اسی لیے تو میر صاحب نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے۔ ہم اس شعر کا پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے۔ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا۔ اگر دل لوٹا گیا ہے تو کل کو یہ پھر آباد بھی ہوسکتا ہے۔ بس آدمی کو اتنی ہمت ضرور دکھانی چاہئے کہ اپنے شوق کو اپنے قابو میں کرے پھر دیکھے شہر دل کا نظم و نسق کس طرح چلتا ہے۔

شوق کی حالت غیر

لیکن ذرا ٹھہریئے میں نے جو ابھی ابھی ''دل کا نظم و نسق'' کے عنوان کے تحت میر صاحب ہی کے شعر کے حوالے سے یہ کہا ہے کہ دل تو لٹ جاتا ہے لیکن شوق پھر بھی نہیں مرتا تو اس کے ساتھ یہ بھی تو کہا ہے کہ آدمی کو اپنے شوق کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔ بس میر صاحب نے اپنے ایک دوسرے شعر میں اس صورت حال کا بھی بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

سینے میں شوق میرؔ کے سب درد ہو گیا
دل پر رکھا تھا ہاتھ سو منہ زرد ہو گیا

ارے کس قدر دکھ کی بات ہے کہ شوق کی طرف سے عدم توجہی کے باعث میر کے سینے میں اب درد ہی درد رہ گیا ہے شوق کا کہیں نام و نشان بھی باقی نہیں رہا...... یہ صورت حال تو بہت ہی خطرناک ہے...... میر کے دل پر ہاتھ رکھ کر جو ہم نے دیکھا تو ہمارا منہ زرد ہو کر رہ گیا۔ یعنی یہ تو ایک انسان کے لیے بہت ہی ہلاکت خیز صورت حال ہے کہ اس کے دل میں کوئی شوق باقی نہ رہے بلکہ اس سے بھی زیادہ خرابی کا عالم یہ ہے کہ شوق کی جگہ درد نے لے لی ہے۔ گویا مایوسی کا عالم اپنی انتہا کو پہنچنے والا ہے۔ اور ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ میر کو اس حال غیر سے نکالنے اور بچانے کی ضرورت ہے۔ آدمی کا دل لٹ جائے تو ایسی کوئی خطرناک بات نہیں۔ اس کے دل کا شوق پھر بھی قائم رہنا چاہئے۔ شوق کا قائم رہنا گویا عالم امکان کو پیش نظر رکھنے کے مترادف ہے۔ اور جب آدمی کے سامنے عالم امکان رہتا ہے تو پھر ایسی کوئی خطرے کی بات نہیں ہوتی۔ مگر شعر زیر بحث ہیں ''منہ زرد ہو گیا'' کے الفاظ سے پتا چل رہا ہے کہ صورت حال خراب ہو گئی

ہے۔اسے جلد از جلد درست کرنا بے حد ضروری ہوگیا ہے ورنہ اس کا نتیجہ اچھا نظر نہیں آتا۔اس شعر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ میر صاحب ایسا کبھی نہیں چاہتے کہ آدمی مایوسی کے عالم میں خود کو داخل کردے۔''منہ زرد ہونا'' خطرے کے الارم کے طور پر ہی نہیں ہے۔اس میں دردمندی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔اس شعر میں گریمر کے لحاظ سے میر کو تھرڈ پرسن قرار دینے سے یہ ہمدردی مزید نمایاں ہوگئی ہے۔اور پھر یہ ہمدردی میر تک محدود نہیں رہتی پورے عالم انسانیت کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔''منہ زرد ہونا'' یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اس کے ساتھ یعنی منہ زرد ہونے کے ساتھ ساتھ دل سے یہ دعا بھی نکل رہی ہے کہ خدا نہ کرے کہ شوق کی جگہ دل میں درد ہی درد رہ جائے شوق کو ہمیشہ قائم و دائم رہنا چاہئے۔

دامن کو ٹک ہلا......

کسی کام کو بگڑتے دیر لگتی ہے بنتے سنورتے دیر نہیں لگتی... میں نے یہ انوکھا جملہ اپنے آپ نہیں لکھ دیا میر صاحب کے ایک شعر سے اخذ کیا ہے۔ وہ شعر ذرا بعد میں عرض کروں گا پہلے دو چار باتیں اس جملے سے متعلق گوش گذار فرما لیجئے۔ دنیا کے اہل دانش اپنے کسی مشاہدے یا تجربے کو جتنا دیکھتے ہیں یا عمل میں لاتے ہیں اسی آدھی تہائی حقیقت کو اس طرح بیان کر دیتے ہیں جیسے یہ پوری حقیقت ہے۔ اور پھر مجھ ایسا بے چارہ عام آدمی اہلِ دانش کے اس ناقص بیان کو اپنی زندگی میں مسلسل استعمال کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں اب تک یہ بات بڑی سچائی کے طور پر پیش کی جاتی ہے کہ کسی کام کو بنانے میں دیر لگتی ہے اسے بگاڑنے میں دیر نہیں لگتی۔ حالانکہ یہ بات ایک حد تک تو درست ہے پوری طرح درست نہیں لطف کی بات یہ ہے کہ روزمرہ زندگی کے عام کاموں کے لیے تو یہ بات درست ہے مثلاً گھر بنانا۔ واقعی گھر بنتا دیر میں ہے لیکن اگر اس کو آپ گرانا چاہیں تو یہ کام آپ نسبتاً جلدی کر سکتے ہیں۔ مگر ہم اپنے ورز مرہ سے بلند عمدہ کاموں کے بارے میں یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ کوئی عمدہ کام کوئی عمدہ قدر جب آپ کی زندگی میں رچ بس جاتی ہے تو اس کو آپ آسانی کے ساتھ اپنی زندگی سے جدا نہیں کر سکتے۔ یہ تو گوشت سے ناخن جدا کرنے والی بات ہے ہاں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ناممکن بات نہیں آپ اپنے آپ کو لہولہان کر کے گوشت سے ناخن جب چاہیں جدا کر سکتے ہیں۔ مگر خود کو لہولہان کرنے سے بچنے کے لیے عموماً ہوتا یہ ہے کہ ہم آہستہ آہستہ اپنی اس قدر کو اپنے سے جدا کرتے ہیں اور یوں یہ کام گویا دیر میں بگڑتا ہے۔ یہ جلدی سے سنور کیسے سکتا ہے؟ یہ جواب دینے سے پہلے میں میر صاحب کا

وہ شعر یہاں پیش کر رہا ہوں۔

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ بجھی ہے دلوں کی آگ

آپ جانتے ہیں کہ جو لوگ اپنی جان جلا کر اپنے ماحول کو روشن کیے رکھتے ہیں یا جان جلانا جن کی عادت بن چکی ہوتی ہے آپ آسانی سے ایسے لوگوں کو جان جلانے کے عمل سے روک نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ جان کے جلانے کا یہ کام اپنی جگہ ایسا پرخلوص ہوتا ہے کہ اس میں شریک لوگ بے لوث ہو کر اپنی جان جلاتے ہیں اور اپنے اردگرد کی فضاء کو حتی الامکان روشن رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ مطلب یہ ہے کہ بے لوث ہونا اور خالص ہونا ان لوگوں کو بہت مضبوط کر دیتا ہے۔ لیکن اگر معاشرہ ان لوگوں کے خلوص اور بے لوث ہونے کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا یا انہیں مسلسل عدم توجہی اور تغافل کا شکار رکھتا ہے تو یہ لوگ بھی افسردہ ہونے لگتے ہیں اور آپ جانتے ہیں ان لوگوں کا افسردہ ہونا پوری زندگی کے پژمردہ ہونے کے برابر ہے۔ میر صاحب اپنے شعر زیر بحث میں اسی خطرناک صورت حال سے ہمیں باخبر کر رہے ہیں۔ اور بڑے دُکھ اور درد سے کہہ رہے ہیں کہ سوختہ جان لوگوں کی افسردگی تو ایک قہر ایک عذاب کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن نکتہ کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی افسردگی کو دور کرنا کوئی مشکل یا دیر طلب کام نہیں ہے بس کوئی ذرا ان کی طرف متوجہ ہوگا ذرا ان کو اپنے دامن کی ہوا دے گا تو ان کی افسردگی دور ہو جائے گی۔ دلوں کی آگ بجھتی دیر میں ہے لیکن روشن بہت جلد ہو جاتی ہے۔ بس آپ کے دامن کی معمولی سی ہوا۔ آپ کی ذرا سی توجہ...... شعر زیر بحث میں ''ٹک'' کا لفظ کلیدی لفظ ہے۔ اور اسی لفظ سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ اچھے لوگوں کو منانا مشکل کام نہیں...... اچھائی کو جلدی واپس لایا جا سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں جلدی سے راضی ہو جانا من جانا اللہ کی ایک بہت بڑی صفت ہے۔

میر صاحب کی کڑوی یا نشیلی تنقید

انسان کے لیے خدا نے اس دنیا کو جنت کے طور پر تخلیق کیا تھا جبھی تو آدم اورحوا کو جنت میں اتارا گیا تھا تا کہ وہ جنت میں رہنے کے آداب سے واقف بھی ہو جائیں اور ان آداب کے عادی بھی...... یہ تو ہم اور آپ سب جانتے ہیں کہ جس جنت میں آدم حوا کو اتارا گیا وہ اسی کرۂ ارض کا ایک حصہ تھی...... لیکن آدم اور حوا نے صبر و تحمل سے کام نہیں لیا جس کی وجہ سے انہیں اس جنت سے نیچے اتار دیا گیا۔ آدم کی جلد بازی نے اسے قدرت کے بہت بڑے الطاف و اکرام سے محروم تو خیر پھر بھی نہیں کیا لیکن اس میں ایک امتحان کی صورت حال پیدا کر دی۔ جلد بازی کے بارے میں میر صاحب کا ایک شعر ہے۔ بلکہ یہ شعر انسان کی ناکامی کے ضمن میں کمال کی ہدایت کا حامل ہے۔

ناکام اس لیے ہو کہ چاہو ہو سب کچھ آج
تم بھی تو میر صاحب قبلہ عجول ہو

عجول عجلت سے ہے اور عاجلہ عربی میں **Fleeting Now** سامنے تیرتی ہوئی موجود چیز کو کہتے ہیں عجول کے معنی ہیں جلد باز کے...... تو میر صاحب ناکام ہونے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ آدمی میں صبر و حوصلہ اور تحمل کی استعداد تو ہے لیکن وہ اس سے کام نہیں لیتا اس لیے ناکام ہوتا ہے...... بہرحال آدم و حوا کے لیے یہ دنیا اگر تکلیف اور درد آلام کا باعث بنی ہے تو صرف اور صرف اس لیے کہ آدم و حوا نے صبر کا دامن چھوڑ دیا اور یوں پوری عالم انسانیت اس جلد بازی کا شکار ہو کر رہ گئی۔ لیکن میر صاحب کے جس شعر پر میں بات کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے۔

ہو جائے کیوں نہ دوزخ باغ زمانہ ہم پر
ہم بے حقیقتوں کے کردار، ایسے ہی تھے

میر صاحب بنی نوع آدم پر جو اس شعر میں کڑی تنقید کر رہے ہیں وہ یہ تسلیم کر کے کر رہے ہیں کہ یہ دنیا ایک باغ ایک جنت کی طرح آج بھی ہے۔ اس باغ دنیا کو جو چیز دوزخ میں تبدیل کرتی ہے وہ انسان کا کردار ہے۔ اس کا عام چلن ہے اس کا اپنے ابنائے جنس سے عام رویہ ہے...... سلوک ہے، برتاؤ ہے...... آدمی اگر دوسرے آدمی کو بھی اپنے جیسا آدمی اور انسان سمجھنا سیکھ لے تو دنیا کے سارے دکھ درد دور ہو سکتے ہیں۔

لیکن میں سمجھتا ہوں شعر زیر بحث میں بے حقیقت کی صفت اور یہ لفظ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ آدمی اس وقت تک بے حقیقت رہتا ہے۔ جب تک وہ اپنے دوسرے ابنائے جنس کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا اس طرح دیکھا جائے تو حقیقت کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے تو ہے ہی لیکن اس کا یعنی اپنی ذات کا احساس بھی اس وقت تک اسے نہیں ہوتا جب تک وہ آدمی غیر ذات کی حقیقت کا قائل نہیں ہو جاتا۔ غیر ذات کی حقیقت کو تسلیم کرنا اس طرح سے دراصل اپنی حقیقت کو وسعت دینا بن جاتا ہے۔ اس کی یعنی اپنی ذات کی حقیقت کو آگے بڑھانا ارتقاء کی منزلوں سے اسے آشنا کرنا۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں ہم یوں ادا کر سکتے ہیں کہ آدمی کی ساری حقیقت غیر ذات کے ہونے کی گواہی دینے سے تعلق رکھتی ہے۔ عموماً ہوتا یہی ہے کہ ہم دوسروں کے ہونا کی گواہی دیئے بغیر کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو گویا بے حقیقت ہو کر قدم اٹھاتے ہیں اور بے حقیقت کا اقدام سے کوئی مثبت نتیجہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ انسان کے کردار کی نشوونما اور کچھ ہونے کا انحصار بھی اسی بات پر ہے کہ انسان غیر ذات کو تسلیم کرے۔ گویا اگر غیر ذات کی ہم گواہی نہیں دیتے تو ہمارا کردار بھی تشکیل نہیں پا سکتا۔ لہٰذا ہم بے حقیقت ہو کر کچھ بھی کر لیں اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں قرار پاتی۔

باقی جو میر صاحب نے شعر زیر بحث کے پہلے مصرع میں یہ کہا ہے۔ ہو جانے کیوں نہ دوزخ باغ زمانہ ہم پر تو اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ جب ہم ایک حقیقت کو حقیقت ہی تسلیم نہیں کر رہے ہیں یعنی باغ زمانہ کو باغ زمانہ ہی نہیں مان رہے ہیں اور اپنے انکار کی آگ سے اس باغ کو جلا رہے ہیں تو پھر بتایئے یہی باغ زمانہ ہمارے اس منفی عمل سے ہمارے اس کردار سے دوزخ نہیں بن جائے گا تو اور کیا ہوگا؟ اچھے کردار کا حقیقی راز اسی امر میں پوشیدہ ہے کہ ہم دنیا کی اچھی اچھی باتوں کو تسلیم کریں۔ کہ شکر گذاری کے اصل عمل کا آغاز بھی ہمارے اسی مثبت گواہی دینے کے عمل سے وابستہ ہے۔ اور شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع میں جو ردیف کے باعث کردار ایسے ہی تھے بات ماضی میں چل جاتی ہے تو اس کا واضح مطلب بھی یہی ہے کہ باغ زمانہ ہمارے لیے دوزخ یک لخت نہیں بن گیا اس میں ہمارے تغافل کا ہاتھ ہے جو ایک عرصے سے چلا آ رہا ہے۔

میر صاحب کی اس کڑی تنقید کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اس دُنیا میں جتنی کوئی بڑی خرابی یا تباہی آتی ہے وہ اپنے آپ سے نہیں آ جاتی اس کے پیچھے بنی نوع آدم کی ناشکر گذاری کا ایک طویل عمل ہوتا ہے۔

شاعروں کیلئے میر صاحب کا ایک زبردست پیغام

ممکن ہے کہ جس پیغام کو میں میر صاحب کا زبردست پیغام کہہ رہا ہوں وہ آپ کے لیے اتنا زبردست نہ ہو۔ لیکن اگر اس پیغام کی اہمیت کے پیش نظر میں اس کو زبردست کہہ رہا ہوں تو کیا آپ میری تائید نہیں فرمائیں گے۔ بہرحال میں نے اس پیغام کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانے کے لیے اگر ایسا کہا ہے تو میر صاحب کا وہ شعر سن کر یقیناً آپ میری تائید فرمائیں گے۔

شاعر ہو مت چپکے رہو اب چپ میں جانیں جاتی ہیں
بات کرو ابیات پڑھو کچھ بیتیں ہم کو بتاتے رہو

ویسے تو اس شعر میں ایک لفظ ''اب'' سے یہ پتا چل رہا ہے کہ یہ صورت حالات بالکل تازہ تازہ ہے کہ اس وقت چپ رہنا کوئی عقلمندی تو کیا ہونی تھی بلکہ حد درجہ کی بزدلی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اب چپ رہنے سے جانیں جاتی ہیں۔ خاموشی جان کا خطرہ بن گئی ہے۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ صورت حالات یا اس صورت حالات کی تازگی یعنی لفظ اب کی تازگی ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ ابھی تک دنیا کے حالات جوں کے توں ہیں کہ یہاں ظلم وستم کا زمانہ ختم نہیں ہوا۔ . . اور جب ظلم وستم کا زمانہ ختم نہیں ہوا تو اس کے خلاف آواز اٹھانا بھی عین وقت کی ضرورت ہے۔ اور پھر عام آدمی پر ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھانے کی اتنی ذمہ داری نہیں ہوتی جتنی کہ شاعروں پر کہ شاعر اپنے شعور کی مدد سے اس ظلم وستم کی صورت حال کو زیادہ بہتر طریقے سے نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ظلم وستم کے خلاف

آواز کسی طرح اٹھائی جانی چاہیے...... احتجاج میں جب تک تاثیر کی قوت پیدا نہیں ہوتی یہ اپنا مقصد پورا نہیں کرسکتا...... اور اس ضمن میں شاعروں سے بڑھ کر کون سے افراد معاشرہ پر تاثیر آواز میں احتجاج بلند کرسکتے ہیں۔

جس طرح خطرے کا الارم شعر زیر بحث کے مصرع اوّل کا یہ ٹکڑا ہے ''اب چپ میں جانیں جاتی ہیں'' اور جس طرح اس سے صورت حال کی نزاکت کا پتا چل رہا ہے اسی نسبت سے اس شعر کے دوسرے مصرع میں یہ تدبیر بھی پوری تفصیل سے بتائی گئی۔ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے۔ تو چپ کا علاج آپ جانتے ہیں چپ کی ضد میں ہے اور ''چپ کی ضد ہے بات''...... لہٰذا شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع میں علاج کی ایک طرح ساری تدبیریں بیان کر دی ہیں...... ''بات کرو ابیات پڑھو کچھ بیتیں ہم کو بتاتے رہو''

آپ جانتے ہیں جس طرح ''چپ'' کے ہزاروں رنگ ہیں اسی طرح بات کے بھی بہت سے رنگ ہیں۔ اور اس شعر کے دوسرے مصرع میں ایک طرح میر صاحب نے ان سب رنگوں کی طرف اشارے کر دیئے ہیں۔ مثلاً جب میر صاحب یہ کہہ رہے ہیں ''بات کرو'' تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ شاعروں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ یہ مت سوچو بات کس طرح کی جائے۔ اس وقت سوچنے کا موقع نہیں اس وقت تو ظلم وستم کے خلاف جس طرح بھی تمہاری زبان سے آواز بلند ہوتی ہے اسے بلند ہونے دو اور ظلم وستم کے خلاف جو جذبات اس وقت تمہارے دل میں موجزن ہیں وہ خود فیصلہ کریں گے کہ بات کس طرح کی جائے۔ اور ایسے وقت میں جذبات کا فیصلہ بہت برمحل ہوتا ہے اور شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ جذبات کا فیصلہ ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھانے میں جس قدر کارگر موثر درست اور نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے ایسا کسی اور موقع پر نہیں ہوتا...... جذبات ہمیں بہت سے مواقع پر غلط راہوں پر لے جاسکتے ہیں لیکن ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھانے میں ان کا اقدام صحیح سمت کی طرف لے جانے کا موجب بنتا ہے۔ لہٰذا میر صاحب کا پہلا پیغام تو یہ ہے کہ ''بات کرو'' کیسے کرو؟ کس طرح کرو؟ کہاں کرو؟ کب کرو؟ ان سوالات

پر غور کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ ظلم وستم کی شدت ہمیں اس کے لیے کوئی وقت فراہم کرتی ہے...... بس یوں سمجھ لو بقول غالب ''فریاد کی کوئی لے نہیں ہے۔''

اس کے بعد ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنے کے ضمن میں میر صاحب کے پیغام کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ ''ابیات پڑھو'' یعنی تم نے جو باتیں پہلے سوچ سمجھ کر کہ رکھیں ہیں ان کی قرأت کا وقت بھی آ گیا ہے۔ یعنی جیسے ہی تم ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کر کے اپنے جذبات کو قدرے قابو میں لے آؤ تو پھر وہ باتیں یعنی ابیات پڑھو جن میں تم نے اپنے غور وفکر کے اجالے تیز شعاعوں کی صورت میں یعنی ظلم وستم کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی کرنوں کی صورت میں جمع کر رکھے ہیں۔ اپنا وہ اسلحہ بروئے کار لاؤ...... اور اس کے بعد تیسرا مشورہ یا میر صاحب کے پیغام کا تیسرا حصہ یہ ہے کہ ''کچھ بیتیں ہم کو بتاتے رہو'' یعنی ایسا بھی ممکن ہے یعنی اس کا امکان بھی ہے کہ ہم ظلم وستم کی صورت حال کو اچھی طرح نہ سمجھ رہے ہوں...... دنیا میں ظلم وستم اسی وقت فروغ پاتے ہیں جب ان کو سمجھا نہیں جاتا۔ ظلم وستم کو ظالم اور ستم گر تو خیر جلدی سے کیا سمجھیں گے ابھی تک افسوس کا مقام اور انسانی تاریخ کا طرۂ امتیاز یہی چلا رہا ہے کہ مظلوم لوگ یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ان پر کیوں ظلم وستم روا رکھا جا رہا ہے۔ بس مظلوم لوگ احتجاج بھی کرتے ہیں تو بغیر سوچے سمجھے اور اس میں اگر کوئی سوچ کام کر رہی ہوتی ہے تو یہی ہے کہ اس ظلم وستم سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ چنانچہ ظلم وستم کو سمجھے بغیر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم صرف اپنی چیخ پکار سے اس کو ختم کر ڈالیں۔ تو میر صاحب اپنے پیغام کے دوسرے اور تیسرے حصے میں یہی بتانا چاہتے ہیں کہ ظلم وستم کے خلاف ضرور احتجاج کرنا چاہئے لیکن اس آواز احتجاج کے عقب میں حالات سے آگاہی کا ہاتھ بہت مضبوط ہونا ضروری ہے سوچے سمجھے بغیر احتجاج کرنا ایک سعی لاحاصل کی علاوہ اور کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

وصلِ محبوب کا امکان

آئیڈیل Ideal اور Real یعنی حقیقت کا مسئلہ انسانی زندگی کا ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ لیکن اس ضمن میں اس امر کو عموماً فراموش ہی کیا جاتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے کہ آئیڈیل یعنی مثال کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو Real سے یا حقیقت سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہو...... ہم آئیڈیل کو Real ہی سے اخذ کرتے ہیں۔ Real نہ ہو تو Ideal کا بھی کوئی وجود نہیں ثابت ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں کوئی Ideal کسی Real ہی سے معرض وجود میں آتا ہے آئیڈیل کی اپنی الگ کوئی حیثیت نہیں۔ میں غالب کا یہ مشہور شعر۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
نہ ہو تو کیسے جئیں اور جو ہو تو کیونکر ہو

یہاں اس لیے کوٹ نہیں کرنا چاہتا کہ غالب نے وصلِ محبوب یا وصال کو ہزار حقیقت پسند ہونے کے باوجود محض ایک فکری یا خیالی چیز بتایا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غالب کے ہاں وصلِ محبوب کو خیالی چیز بتانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وصالِ محبوب کوئی ناممکن چیز ہے وصالِ محبوب کا غالب کے ہاں بھی امکان تو موجود ہے لیکن یہ امکان وقوع میں آنے کے لیے نہیں وصل محبوب تو ایک ارتقائی صورتِ حال ہے کہ آدمی کی فطرت میں کچھ حاصل کرنے کے بجائے بہت کچھ بلکہ سب کچھ حاصل کرنے کی ایک مسلسل خواہش موجود رہتی ہے۔ اور وصل سے وابستہ اِس خواہش کا موجود رہنا ہی اصل حقیقت ہے۔

لیکن جس طرح میر صاحب نے وصلِ محبوب کے موضوع کو اپنے ایک شعر

میں بیان فرمایا ہم اُسے بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ میر صاحب فرماتے ہیں۔

نومید وصل دل نہیں شب ہائے ہجر میں
ان راتوں ہی میں ملنے کی بھی رات ہو تو ہو

دل نومید وصل نہیں یعنی دل وصل محبوب کے ضمن میں مایوس نہیں کیونکہ ہجر کی راتیں تو بے شمار ہیں بلکہ ساری زندگی ہی ہجر کا عرصۂ حیات ہے۔ لیکن ایسی بھی کوئی بات نہیں ہجر کی یہ تمام راتیں صرف ہجر ہی کی رہیں گی دیکھ لینا انہی ہجر کے بے شمار راتوں میں سے کوئی نہ کوئی وصل کی رات۔۔۔ بھی نکل آئے گی...... آپ دل کی اس خواہش کو بلی کے خواب میں چھیچھڑے Wish full Thinking والی بات کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ میر صاحب نے بھی شعر زیر بحث میں وصل کو دل کی بات ہی کہا ہے۔ اس ضمن میں اپنا اظہار خیال تو انہوں نے دوسرے مصرع میں واضح کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ''ان راتوں ہی میں ملنے کی بھی رات ہو تو ہو'' یعنی ہجر کی انہی راتوں میں سے ہو سکتا ہے کوئی وصل کی رات بھی نکل آئے۔ لیکن یہاں میر صاحب یہ بات کسی وثوق سے یا یقین کے ساتھ نہیں کہہ رہے ہیں۔ مگر بغور دیکھا جائے تو دل کا پرامید ہونا بھی ایک اعتبار سے بہت بڑی بات ہے کہ مایوس ہونے کی حقیقت عظمیٰ نے کسی جگہ بھی تعریف نہیں کی۔ مایوس ہونا زندگی کے گوناگوں امکانات کا انکار کرتا ہے جو کسی طرح بھی قابل قبول بات نہیں کہ مایوسی نہ صرف امکانات سے منکر ہونے کے مترادف ہے بلکہ یہ کوئی دلیل عقلمندی بھی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص میں ذرا سی بھی عقل اور فراست ہے وہ کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ اسی حقیقت کے پیش نظر میر صاحب اپنے دل کی ہمنوائی کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ انہی ہجر کی راتوں میں کوئی نہ کوئی رات وصل کی رات بھی ہو سکتی ہے۔ محبت میں ہجر مسلسل بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔

شعر زیر بحث کا سارا لطف عالم ہجر کو عالم وصل سے متصل کرنے میں ہے لیکن ردیف ''ہو تو ہو'' کی خوبی بلاغت یہ ہے کہ شاعر اپنے دل کے پرامید ہونے کی حقیقت سے بھی انکار نہیں کر رہا ہے اور اپنے آپ کو وصل کی اصل حقیقت سے بھی دور نہیں کرنا

چاہتا۔ صحیح معنی میں وصل تو خیر ایک عاشق کو کبھی بھی نصیب نہیں ہوتا اور نہ ایسا کبھی ہونا چاہیئے کہ عاشقی میں خطرناک زمانہ ہجر کا نہیں وصال کا ہوتا ہے۔ ہجر میں تو عاشقی مزید مضبوط ہوتی ہے اس کی جڑیں محبت کرنے والوں کے دلوں میں دور دور تک پھیلتی جاتی ہیں۔ ہجر کا زمانہ تو ایک طرح عاشقی کی ضمانت مہیا کرتا ہے۔ سارا کام خراب تو وصل کی بات کرتی ہے۔

ایک المناک انسانی صورت حال

(اس صورتحال کا تجزیہ میر تقی میر کے اشعار کے حوالے سے)

انسان کے ساتھ ابتداء سے ایک المناک صورتحال یہ چلی آ رہی ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں اچھے لوگ پیدا ہوتے ہیں انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا ہے ان کا جینا حرام کر دینا ایک معمولی سی بات بن کر رہ جاتی ہے۔ اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ہم ساتھ ہی ساتھ یہ بھی شور مچاتے رہتے ہیں کہ زمانہ کس قدر خراب آ گیا ہے کہ اچھے لوگوں کو ٹھیک طرح سے سانس بھی نہیں لینے دیا جاتا۔ اچھے لوگوں کو کون چین کا سانس نہیں لینے دیتا۔؟ جب ہم اس طرح کا سوال اٹھاتے ہیں تو ہمیں اسکا جواب صحیح معنی میں کسی کی طرف سے بھی آتا نہیں دکھائی دیتا۔ ہم ظالموں کے خلاف آواز اٹھاتے بھی ہیں تو اس آواز کو ہر کوئی دوسرا شخص نہیں ہم خود ہزار طریقوں سے غیر موثر بنا دیتے ہیں۔

لیکن ایک المناک صورت حال یہ بھی ہے کہ اس المناک صورت حال کے خلاف احتجاج کو غیر موثر بنانے میں عام لوگوں کا ہاتھ اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ خاص لوگوں کا۔ میری مراد اہل دانش اور اہل قلم حضرات سے ہے۔ مثال کے طور پر اچھے لوگوں کے بارے میں یہ اہل دانش اور اہل قلم ادیب وشاعر اس طرح کلام کرتے ہیں جیسے یہ لوگ :-

عام لوگوں سے بہت زیادہ اعلیٰ وارفع قسم کے لوگ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں اچھا ہونا بہت بڑی بات ہے مگر اس بڑی بات کو عام آدمی بھی حاصل کرسکتا ہے۔ انسان کی ہر اعلیٰ قسم کی بات میں ہر انسان کی شمولیت یقینی بھی ہوتی ہے اور اس اچھی بات کے امکانات بھی ہر انسان کی ذات میں موجود ہوتے ہیں۔

مگر وہی بات عام طور پر اہل قلم حضرات اچھے لوگوں کی اچھائی کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے بے چارہ عام آدمی اس اچھائی تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ میں ان اہل دانش اور اہل قلم حضرات کی نیت پر شک ہرگز نہیں کر رہا ہوں میں تو صرف اتنی سی بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اچھائی کا پرچار کرنے میں یا اس کو فروغ دینے میں اہل قلم حضرات کا طریقِ کار عموماً مناسب اور کارگر نہیں ہوتا...... کیوں؟ اس لیے کہ وہ اچھائی کو یعنی اعلی انسانی اقدار کو اپنے مبالغہ آمیز پیرایہ بیان کے باعث عام لوگوں کی پہنچ سے بالا کردیتے ہیں یا جدا کردیتے ہیں جی ہاں اس طرح جدا جیسے گوشت سے ناخن کو جدا کیا جاتا ہے اور پھر اس جدا کرنے کے عمل سے جو لہو بہتا ہے اس پر ایک لحظہ کو نظر بھی نہیں ڈالی جاتی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ جو ابتداء سے لے کر آج تک اپنی جگہ ٹھہری ہوئی ہے یعنی اس میں ظلم وستم کی جو زیادتی پائی جاتی ہے اس کی وجہ اہل دانش کی وہ غلط اپروچ ہے جو وہ اعلیٰ انسانی اقدار کے ضمن میں روا رکھتے ہیں اور یوں اعلیٰ انسانی اقدار کے دروازے خواہ مخواہ عام لوگوں کے لیے بند ہو جاتے ہیں کہ اعلیٰ انسانی اقدار کو صرف خاص لوگ ہی اپنا سکتے ہیں۔

عام اہل قلم کی طرح میر صاحب نے بھی اپنے ایک شعر میں اس المناک صورت حال کا ذکر کیا ہے یا یوں کہ لیجئے کہ شکایت کی ہے کہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اچھے لوگوں کو دوسرے لوگ کس طرح اپنے ہاتھ سے گنوا دیتے ہیں۔

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

مگر میر صاحب نے اپنی اس شکایت میں ایک اضافہ کیا ہے جو اس المناک

صورتحال کو مزید المناک بناتا ہے کہ اچھے لوگوں کو معاشرے کے دوسرے لوگ عموماً کسی خاص منصوبے کے تحت خراب اور تباہ و برباد نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی ایک معمولی سی شوخی کے بہانے سے اتنے اچھے لوگوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ گویا یہ سب کچھ مذاق ہی مذاق میں ہو جاتا ہے...... جی ہاں اتنا بڑا ظلم مذاق ہی مذاق میں۔اس المناک صورت حال کا حل میر صاحب نے اس طرح نکالا ہے کہ انہوں نے عام اور خاص کا فرق مٹا دیا۔ ان کے خیال میں ہر آدمی عام بھی ہے اور خاص بھی۔ دوسرے لفظوں میں ہر آدمی میں عام اور خاص ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس لئے میر صاحب نے عوام کو بھی اعلی انسانی اقدار سے محروم نہیں کیا...... اور تو اور انہوں نے آدمی اور انسان کے فرق کو بھی قائم نہیں رکھا...... چنانچہ وہ جب بھی بنی نوع آدم کے بارے میں بات کرتے ہیں تو سب کو اعلیٰ درجہ میں شریک کرتے ہیں۔ تمام بنی نوع آدم اور پورے عالم انسانیت کو سامنے رکھ کر میر صاحب فرماتے ہیں۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

یہاں ''مت سہل ہمیں جانو'' سے مراد یہ ہے کہ قدرت نے انسان کو آسانی سے تخلیق نہیں کر دیا۔ پوری توجہ سے تخلیق کیا ہے اس لیے ہماری تخلیق کو یعنی انسان کی تخلیق کو معمولی چیز نہیں سمجھنا چاہئے...... اگر تخلیق آدم کی اہمیت کا لوگوں کو احساس ہو تو پھر وہ اس طرح اچھے لوگوں پر ظلم وستم کو روا نہ رکھیں۔ میر صاحب کا ایک اور شعر سنئے۔

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

آئینے کا حیرت میں ہونا بھی واضح ہے اور اس کا صاف و شفاف ہونا بھی۔ گویا جو کوئی بھی آئینے کے سامنے آتا ہے وہ اسے دیکھ کر حیران ہے کہ کیا کمال کی صورت میرے سامنے آتی ہے۔ لیکن آئینہ اسی وقت کسی کو دیکھ سکتا ہے جب وہ صاف و شفاف ہو لہٰذا شعر زیر بحث میں ایک نکتہ یہ بھی قابل غور رہے کہ جو کوئی شخص بھی اپنے

آپ کو اپنے دل کو آئینے کی طرح صاف و شفاف رکھتا ہے پھر وہ آئینے کی طرح دوسروں کو اپنے دل میں اتار لیتا ہے یا دوسرے لوگ اس کی ذات میں اتر جاتے ہیں اور پھر اسی طرح صاف دل لوگ آئینے کی مانند ہر صورت کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں یعنی آدمی کا دل صاف و شفاف ہو تو پھر اسے دنیا کے سب لوگ صاف ستھرے اور خوبصورت نظر آتے ہیں اتنے خوبصورت کہ وہ حیران رہ جاتا ہے کہ اس دنیا کے لوگ کس قدر خوبصورت واقع ہوئے ہیں...... وہ حسن و جمال کہ جو اس کے چاروں طرف رخشندہ تابندہ ہے خود اس کی اپنی ذات کو کس قدر رخشندہ و تابند بنا رہا ہے...... شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع میں جو ایک سوال اٹھایا گیا ہے اس کی بلاغت بھی داد کے قابل ہے...... حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا؟ مطلب یہ ہے کہ آئینہ تو ہر صورت کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہے تو صحیح معنی میں یہ کس کا حیران ہے؟ کس کے لیے حیران ہے۔ جس سے صاف طور پر پتا چل رہا ہے کہ ہر صورت ایسی ہے جس کو دیکھ کر حیران ہونا آئینے کی عادت ہی نہیں اس کے توحید صفت ہونے کی بھی دلیل ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں میر صاحب یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ ہر آدمی اچھا ہے اچھائیوں اور خوبیوں سے لبریز ہے صرف دیر اس بات کی ہے کہ دوسرے لوگ اپنے ابنائے جنس کی اس بنیادی بھلائی اور اونچائی کو کبھی فراموش نہ کریں۔ ایسے عالم میں وہ المناک صورت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو کہ آج عام ہے یعنی اچھے لوگوں کو سکون اور آرام کی زندگی نہیں گذارنے دی جاتی۔ اس ضمن میں میر صاحب کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے۔

کہتے ہیں کوئی صورت بے معنی یاں نہیں ہے
یہ وجہ ہے کہ عارف منہ دیکھتا ہے سب کا

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس سے قبل کے شعر میں آئینہ سب کا منہ دیکھ رہا تھا اور حیران ہوئے چلا جا رہا تھا۔ لیکن اس شعر میں یہ صورت حال یوں بلندی پر پہنچ جاتی ہے کہ آئینہ تو بے جان اور بے شعور چیز تھی وہ اگر سب کا منہ تکنے میں مصروف تھا تو ایسی زیادہ قابل غور بات نہیں۔ قابل غور بات تو یہ ہے کہ ایک عارف شخص جو بہت کچھ

معرفت رکھتا ہے اس کا حال بھی یہی ہے کہ وہ بھی یہاں ہر شخص کی صورت دیکھ کر حیران ہوتا ہے اور خدا کی صناعی کی داد اپنی آنکھوں کی وساطت سے بہم پہنچا رہا ہے۔ آدمی کی تعریف میں میر صاحبؒ کے تین شعر اور سماعت فرمائیے۔

بات کیا آدمی کی بن آئی ...... آسماں سے زمین پنوائی

آدمی سے ملک کو کیا نسبت ...... شان ارفع ہے میؔر انساں کی

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا ...... خدائی صدقے کی انسان پر سے

ظلمت شہر اور سورج کا چراغ

حسب معمول میر صاحب نے ایک اور کمال کا شعر کہا ہے۔ اور بظاہر کمال سادگی سے کہا ہے...... جس کی داد دینا آپ پر مجھ پر اور ہم سب پر واجب ہے...... سو وہ شعر یہ ہے۔

ہے جو اندھیر شہر میں ، خورشید
دن کو لے کر چراغ نکلے ہے

انسانی صورت احوال یہ ہے کہ جیسا انسان کو روشن خیال اور روشن ضمیر ہونا چاہئے تھا اور اس کی اس روشن خیالی اور روشن ضمیری کے سبب جس قدر اس دنیا کو اب تک نو بہ نو اجالوں سے لبریز ہو جانا چاہئے تھا ایسی صورت حال ہنوز وقوع میں نہیں آئی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ابھی تک دنیا میں واقعی چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اور اسکا ایک واضح ثبوت میر صاحب اپنے شعر زیر بحث میں اس طرح پیش کر رہے ہیں۔ کہ دیکھ لیجئے اس شہر دنیا میں اندھیرے اور ظلمت کی صورت حال یہ ہے کہ دن کے وقت سورج چراغ لے کر نکلتا ہے تب کچھ نظر آتا ہے یا اس کے اس طرح چراغ لے کر نکلنے سے دوسروں کو کچھ دکھائی دینے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ آپ نے غور فرمایا یہاں میر صاحب نے سورج کو چراغ دکھانے کی نادانی سے کام نہیں لیا بلکہ الٹا سورج کے ہاتھ میں چراغ تھما دیا۔ لو میاں تم اپنے آپ کو بہت رخشندہ و تابندہ سمجھتے تھے ذرا اس چراغ کو بھی ہاتھ میں لے کر دیکھو تمہیں پتا چلے گا کہ صحیح معنی میں روشنی کس کو کہتے ہیں اور روشن ہونے کی تعریف کیا ہوتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ طبعی دنیا یعنی فزیکل ورلڈ کی روشنی یہی سورج چاند ستاروں کی روشنی فکر انسانی کی روشنی کے مقابلے میں ایسی ہی ہے کہ سورج اس فکر انسانی کی روشنی کے سامنے زیادہ سے زیادہ ایک چراغ کی حیثیت رکھتا ہے......اور دوسری تمام روشنیاں ایک طرح کے اندھیروں سے بڑھ کر کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہی بات کہ جب تک انسان اپنی فکر کو صحیح خطوط پر نہیں لائے گا دنیا کے تمام اجالے اندھیروں کی طرح رہیں گے۔ دنیا میں صحیح روشنی صحیح نور اسی وقت پیدا ہوگا اور دنیا کو بقعۂ نور بنائے گا جب وہ یعنی انسان صحیح طور پر سوچنا شروع کردے گا۔

اس شعر کی معنوی صورت حال تو میرے مندرجہ بالا بیان سے قدرے واضح ہوگئی ہوگی۔ اس شعر کی لفظی صنعت گری بھی قابل داد ہے اور پھر اس لفظی صناعی سے جو تصویر جو Image ہمارے سانے آتی ہے اس کا انوکھا پن بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور یہی نہیں یہ انوکھا پن ہمارے دیکھنے کی صلاحیت کو فروغ بھی بخشتا ہے۔ پہلے مصرع میں خورشید اور پھر دوسرا پورا مصرع "دن کو لے کر چراغ نکلے ہے"۔ سے یوں لگتا ہے دن کو عام روشنی مع خورشید ایک طرف کو کھڑی ہوگئی ہے یا اپنی جگہ مع خورشید کھڑی ہے اور دوسری طرف اس روشی میں شہر کے اندھیرے کا ایک الگ تسلط ہے۔ اور یہ شہر کا اندھیرا جہالتوں کا اندھیرا ہے جس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اگر آدمی کی جہالت قائم رہے تو دوسرے تمام سورج چاند ستارے کہکشائیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اصل روشنی تو علم وعرفان کی اور عقل کی ہے۔ باقی آپ فزیکل روشنی کو ہزار تسلیم کرتے رہیں اور چیختے چلاتے رہیں کہ جناب والا میر صاحب آپ یہ کیا فرما رہے ہیں کہ شہر میں اندھیرا ہے۔ حضور کیا آپ سورج کو نہیں دیکھ رہے ہیں اس کی دھوپ کو محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ اس پر میر صاحب آپ کو فوراً جواب دیتے ہیں "صاحب آپ نے دھوپ کو محسوس کرنے کی بات خوب کہی ہے۔ جب سورج نکلے گا تو دھوپ خواہ مطلع صاف نہ ہو تب بھی محسوس تو ہوگی مگر آپ اپنے اس احساس کو ایسی صورت میں کہاں لے جائیں گے جب آپ کو سورج کی یہ روشنی .یادہ سے زیادہ چراغ کی روشنی کی طرح محسوس ہوگی...... عقل اور شعور

سے کام نہ لیا جائے تو احساسات بھی اپنا کام پوری طرح سرانجام نہیں دیتے۔ میر صاحب نے کیا سادگی سے کس بے تکلفی سے اس قدر ہولناک صورت حال کا اظہار کر دیا کہ آدمی اس پر غور کرے تو اس کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں۔

ہے جو اندھیر شہر میں ، خورشید
دن کو لے کر چراغ نکلے ہے

شعر زیر بحث کی پہلی قرأت آپ کو پوری طرح متاثر نہیں کرتی بلکہ کچھ عجیب بے تکی سی لگتی ہے لیکن دوسری تیسری قرأت پر جب آپ "ہے جو اندھیر شہر میں" پر آ کر رکتے ہیں اور جیسے ہی پہلے مصرع کا اگلا تنہا لفظ خورشید آپ کے سامنے آتا ہے تو پھر معانی کے در کھلنے شروع ہوتے ہیں۔ اچھا تو دنیا میں اتنا اندھیرا ہے کہ سورج کو بھی چراغ لے کر نکلنا پڑ رہا ہے۔ لیکن یہ صورت حال آج کی نہیں ہے۔ شروع سے چلی آ رہی ہے۔ آدمی اپنی جہالتوں کو دور نہیں کرتا...... اپنی سوچ کو صحیح خطوط پر نہیں چلاتا۔ چنانچہ جب تک جاہل رہے گا دنیا میں اندھیرے تو چھائے رہیں گے...... اور میر صاحب جیسے غریب چیختے چلاتے رہیں گے لوگو ہوش میں آؤ انسان کی جہالتوں نے ہمیں بری طرح اندھیروں میں غرق کر رکھا ہے۔ عام سورج کی شعاعوں سے اپنے چہروں کو کیا دھونے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو۔ اپنے دلوں کے چراغوں کو روشن کرو تا کہ تمہیں پتا چلے صحیح معنی میں روشنی کس کو کہتے ہیں۔

مثال اور حقیقت

مثال یعنی آئیڈیل اور Real یعنی حقیقت کا چکر کس کو پریشان نہیں کرتا۔
ایک وقت میں مثال آپ کی مٹھی میں ہوتی ہے تو دوسرے لمحے آپ کی پوری ذات مثال کی گرفت میں آجاتی ہے۔ ایسے لمحوں میں سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ ہوتی ہے ہے کہ حقیقت اِدھر اُدھر نہ ہونے کے باوجود کہیں اِدھر اُدھر ہو جاتی ہے یعنی آپ آئیڈیل کے چکر میں Real کو فراموش کر دیتے ہیں۔ کوئی محسوس نہ کرے تو دوسری بات ہے ورنہ ایسے وقت میں آدمی ناشکری کے عذاب میں بری طرح سے مبتلا ہوتا ہے۔ اس عذاب کی ابتلا کا احساس اس لیے نہیں ہوتا کہ آپ اس وقت مثال آئیڈیل کے سحر میں آئے ہوئے ہوتے ہیں...... میں نے یہاں مثال کے سحر کو اس کے جادو کو ناشکری کا عذاب اس لیے کہا ہے کہ مثال اپنی جگہ کوئی چیز نہیں۔ ہے یہ سب فیض حقیقت ہی کا ہے۔ حقیقت نہ ہو تو آئیڈیل کا ہمیں کہیں نام ونشان بھی نہ ملے۔

حقیقت کو اگر آدمی آنکھیں کھول کر دیکھے اور آنکھیں کھول کر اُسے استعمال میں لاتا رہے تو آئیڈیل یعنی مثال اس میں سے خود بخود دن کے اجالوں کی طرح پھوٹنی شروع ہو جاتی ہے۔ مگر آدمی حقیقت کو آنکھیں کھول کر کیوں دیکھے اور آنکھیں کھول کر اُسے استعمال میں کیوں لائے کہ آنکھیں کھولنے میں تو دیر لگتی ہے۔ اِدھر آدمی کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ آنکھیں بند کیے کیے ہی اُسے اسکا آئیڈیل اس کی مثال ہاتھ لگ جائے۔ تو ساری خرابی اس تن آسانی اور ہماری سہل انگاری کی ہے جسے ہم اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے طرح طرح کے نام دیتے رہتے ہیں۔ رومان بھی انہیں ناموں میں

سے ایک نام ہے۔

میر صاحب نے اپنے ایک شعر میں انسان کی اس صورت حال کو بہت واضح انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں وارننگ بھی دی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس ضمن میں کچھ نہ کر سکیں۔ اور یہ صورتحال ہمارے لیے ماضی کے پچھتاوے میں تبدیل ہو جائے۔ جیسا کہ اس شعر میں ہے۔ اور اسی شعر پر میں بات کرتا چلا آ رہا ہوں۔

تھا وہ تو رشک حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

تو جناب ہمیں اپنے جس آئیڈیل جس مثال کی تلاش ہوتی ہے اور رہتی ہے وہ کہیں دور نہیں ہوتا ہمارے درمیان ہی میں ہوتا ہے۔ ہم آئیڈیل کو جو دور سمجھتے ہیں اس کی وجہ ہماری سمجھ ہمارے فہم کا قصور ہے۔ ہم اپنی قوت صبر و تحمل کو کام میں نہیں لاتے اور یوں اپنی جلد بازی کی وجہ سے زندگی بھر ہمارے ہاتھ پاؤں پھولے رہتے ہیں۔ ورنہ ہم ذرا اپنی فکر سے کام لیں اور صبر و تحمل کو اپنی زندگی کا شعار بنائیں تو ہمارا آئیڈیل کیسے نہ ہمیں حاصل ہو۔

ایک ملاقات

مجھ میں سوچنے سمجھنے کی تھوڑی بہت صلاحیت تو موجود ہے لیکن اس صلاحیت میں تیزی اور طراری نہیں۔ میں عموماً بات کو ذرا دیر سے سمجھتا ہوں۔ مثلاً میں محبت میں پہلی نظر یا ایک نظر کا قائل نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے میں محبت کے لیے ایک ملاقات کو کافی نہیں سمجھتا تھا اور اسکے لیے میر۔ ے پاس بہت سے دلائل تھے جن میں سے پہلی دلیل یہ تھی کہ آدمی سماجی جانور ہے تو اس طرح دو افراد کی محبت کے لیے ایک نظر یا ایک ملاقات کیسے کافی ہو سکتی ہے۔

لیکن پچھلے دنوں جب میر صاحب کا ایک شعر پڑھا تو محبت کے ضمن میں میرے مندرجہ بالا قسم کے خیالات ایک دم بدل گئے.......... ہاں تو میر صاحب کا وہ شعر یہ ہے۔

روز ملنے پہ نہیں نسبت عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

اب جو میں نے اپنے یک طرفہ ہی سہی جی ہاں اپنے ان بہت سے یک طرفہ معاشقوں پر غور کیا تو پتا چلا کہ قریب قریب ان سب کی پہلی ملاقات کے حوالے ہی سے میرے حافظہ میں یہ معاشقے چھوٹے بڑے قمقموں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ باقی میں نے اپنے آپ کو اتنا جرأت مند کبھی نہیں پایا کہ کبھی کسی کو میں نے یہ کہا ہو I love You اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میرے یہ معاشقے صرف ایک ملاقات تک محدود رہے۔ نہیں صاحب میں نے اپنے ان محبوبوں کی گلیوں کے چکر بھی کاٹے ہیں...... اتنا

بھی حوصلہ کیا کہ ان کے گھروں تک ایک بار نہیں کئی بار پہنچا۔ خود ان چلتی پھرتی قیامتوں سے باتیں بھی کیں اور باتوں میں میں نے کبھی بزدلی نہیں دکھائی...... مگر اب جو ان خوبصورت حادثات پر غور کرتا ہوں تو صرف ان میں سے سب کی پہلی ملاقات ہی یاد آتی ہے۔ اور غالباً اسی پہلی ملاقات پر باقی ساری ملاقاتیں اپنی کوئی حیثیت رکھتی تھیں۔ جن کی اب حافظے میں کوئی حیثیت نہیں رہی...... اس کے علاوہ میں نے اپنے کچھ باقاعدہ عشاق قسم کے مشاق دوستوں سے بھی پوچھا تو وہ کہنے لگے میر صاحب کی بات صدفی صد درست ہے۔

پھر میں نے اپنی اس بات پر غور کیا کہ آخر انسان سماجی جانور ہے میل جول کے بغیر یعنی مسلسل ملاقاتوں کے بغیر محبت اپنے بلند مقام پر کیسے پہنچ سکتی ہے تو پتا چلا کہ زیادہ ملاقاتیں ہمارے سماجی جانور ہونے کے لیے تو کچھ فائدہ مند ہوسکتی ہیں۔ اعلیٰ انسانی محبت کے لیے تو ایک ملاقات ہی کافی ہے۔ ورنہ زیادہ ملاقاتیں اعلی درجے کی انسانی محبت کو نقصان تو پہنچا سکتی ہے فائدہ نہیں پہنچاتیں۔ سو میں نے اس ضمن میں میر صاحب کو مرشد مان لیا۔

ایک عام لیکن نیا تجربہ

ایک زمانے میں لوگ رات کو آسمان کے نیچے سویا کرتے تھے اور آدھی رات گذرنے کے بعد جب اوس گرتی تھی تو بستر سمیت کپڑے خاصے بھیگ سے جاتے تھے جس کی وجہ سے سونے میں لطف نہیں آتا تھا۔ اوس کو روکنے کے لیے قدرے آسودہ حال لوگ اپنی چارپائیوں کے اوپر ایک کپڑا تان لیتے تھے جس کو غالباً شبنمی کہا جاتا تھا۔ پھر بھی عام لوگ اس کپڑے کے بغیر ہی سوتے تھے اور اوس یا شبنم کی ترائی ان کی نیند میں مسلسل خلل انداز ہوتی رہتی تھی۔ میر صاحب نے اس عام سے تجربے کو اپنی غزل کے ایک شعر میں استعمال کیا ہے اور چونکہ پہلے کبھی یہ تجربۂ اشعار میں بیان نہیں ہوا اس لیے میر صاحب کے اس شعر میں یہ ایک بالکل نیا تجربہ محسوس ہوتا ہے اور پھر میر صاحب کے بیان نے اس تجربے سے جو معانی اخذ کیے ہیں تو اس وجہ سے اس عام سے تجربے میں تازگی کا احساس بھی پورے تاثر کے ساتھ موجود ہے۔ لہٰذا اب میر صاحب کا وہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

حاصل ہے کیا سوائے ترائی کے دہر میں
اٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں

دیکھ لیجئے ''ترائی'' اور ''شبنم'' ایسے الفاظ ہیں جو عموماً غزل میں اچھے معنی ہی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن شعر زیر بحث میں قطعی طور پر اچھے معنی میں استعمال نہیں ہو رہے ہیں۔ اس لیے میر صاحب مشورہ دے رہے ہیں اٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں...... یہ تو تھی سیدھی سی بات اب دیکھنا یہ ہے کہ میر صاحب اپنے اس شعر کے

پردے میں ہمیں کہنا کیا چاہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں میر صاحب کے شعر کا پردہ غالب کے شعر کے پردے کی طرح دبیز نہیں ہوتا کہ جلدی سے یا آسانی سے اس کے آر پار نہ دیکھا جا سکے۔۔۔۔ میر صاحب کے شعر کا پردہ تو ایک بہت عمدہ باریک ململ کی طرح کا ہوتا ہے کہ جس میں شعر کے معنی کا جسم نظر آتا ہے تو اس کو دیکھنے اور سمجھنے کو جی خواہ مخواہ چاہنے لگتا ہے۔

ہاں تو میر صاحب ہمیں اپنے اس شعر میں بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اس دہر میں اس دنیا میں سوائے ترائی کے یعنی آنسوؤں کی نمی کے اور رونے دھونے کے علاوہ کیا حاصل ہوتا ہے اور ایسا کیوں ہوتا ہے؟۔۔۔ اس لیے کہ ہم انسانوں کو اپنی عظمت اور اپنی بڑائی کا احساس نہیں۔ ہم خواہ مخواہ ایسی چیزوں کو اپنے سے بلند اور ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہیں جو حقیقت میں ہم سے ارفع و اعلیٰ نہیں ہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں اس کی وضاحت میر صاحب نے اپنے اس شعر زیر بحث میں نہایت خوبی سے کر دی ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ اشرف المخلوقات ہو کر انسان اپنے آپ کو حقیر و کم تر سمجھتے ہوئے اپنی ذات کو خاک کی طرح گردانتا ہے اور آسمان کو اپنے سے بلند و بالا قرار دیتا ہے جبکہ آسمان انسان کی اس ناسمجھی پر آنسو بہاتا ہے (شبنم آسمان کے آنسو نہیں تو اور کیا ہے)۔۔۔۔۔ اس لیے جب میر صاحب اس شعر میں یہ کہتے ہیں کہ "اٹھ آسمان تلے سے" تو اُن کا واضح مطلب یہ ہے کہ اے انسان تو نے اپنے آپ کو آسمان ایک خیالی چیز سے کم تر کیوں سمجھ لیا ہے۔ تجھے یہ کیوں احساس ہے کہ تیری تقدیر کے فیصلے اوپر آسمان پر ہوتے ہیں۔ اے انسان محض تیرے اس احساس کمتری نے تجھے ذلیل وخوار کر رکھا ہے تو اگر یوں اپنے آپ کو ذلیل وخوار نہ سمجھے اور اپنے آپ کو اس طرح کائنات کی اشیاء کے ماتحت نہ سمجھے تو پھر تیری یہ حالت کبھی نہ ہو۔ اگر تو اپنے صحیح احساس عظمت کے ساتھ اپنی کسی غلطی پر آنسو بھی بہائے گا تو تیرے آنسوؤں میں ایک توانائی اور طاقت ہوگی۔ جو کہ اس وقت نہیں ہے۔ جب تو اپنے آپ کو آسمان کے تلے سمجھ رہا ہے۔ تیرا مقام تو آسمان کے اوپر ہے۔ تو اپنے مقام کو نہیں سمجھے گا تو پھر تیرا حشر یہی ہوگا کہ جو ہو رہا ہے۔

''اے شورِ قیامت......''

اس وقت میں میر صاحب کے ایک بہت ہی مشہور شعر کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔۔اور وہ شعر یہ ہے۔

اے شورِ قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں
اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

بظاہر اس سیدھے سادھے شعر میں اور مجھے تو خیر یہ شعر بظاہر بھی سیدھا سادا نظر نہیں آ رہا ہے۔ بہرحال میر صاحب کے اس شعر میں بہت سے نئے اور تر و تازہ نکات پوشیدہ ہیں جنہیں کم از کم میرے اساتذہ نے مجھ پر واضح نہیں کیا تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرِے اساتذہ مجھے اس قابل ہی نہ سمجھتے ہوں کہ مجھ پر ان نکات کو واضح کیا جائے۔ لیکن چونکہ مجھے اپنے قارئین پر پورا پورا بھروسہ ہے اس لیے میں یہاں ان میں سے کچھ نکات پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

ویسے اس شعر کا جو کلیدی لفظ ہے وہ اس شعر کے دوسرے مصرع میں ہے اور بہت ہی معمولی لفظ ہے معمولی ہی نہیں بہت چھوٹا سا بھی یعنی لفظ ''تو''...... اگر اس شعر میں یہ لفظ جی ہاں بہت ہی معمولی سا لفظ تو نہ ہوتا تو اس شعر میں وہ نکات اور وہ معانی پیدا نہ ہوتے جو اب اس معمولی سے لفظ کی وجہ سے ہو رہے ہیں.. ..میں نے اساتذہ کے اشعار کو چھیڑنے کی کبھی جرأت نہیں کی یہاں محض سمجھانے کے طور پر اس طرح کی جرأت کر رہا ہوں۔ مثلاً اگر یہ شعر یوں ہوتا... ....

اے شور قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں
اس راہ سے جب نکلے ہم کو بھی جگا جانا

تو اس ایک معمولی سی تبدیلی سے یعنی ''تو'' کی جگہ ''جب'' لانے سے اس شعر کا مطلب بہت واضح ہو جاتا ہے کہ اے شور قیامت ہم بہت مست ہو کر سونے والے غافل قسم کے لوگ ہیں لہٰذا جب تیرا گذر ہماری طرف سے ہماری راہ سے ہو تو ہمیں خاص طور پر جھنجھوڑ کر جگا دینا تیری بہت مہربانی ہوگی...... لیکن اگر ہم اس شعر کو جوں کا توں رہنے دیتے ہیں تو اس کے معنی کچھ اور ہو جاتے ہیں اور اس شعر میں سے کئی دلچسپ نکات برآمد ہوتے ہیں اور شعر اپنے معنی کے اعتبار سے کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے ..... اس راہ سے جب نکلے ہم کو بھی جگا جانا کا مطلب جیسا کہ ابھی بیان کیا ہے صرف اتنا ہی سا ہے کہ شور قیامت کو جگانے کے لیے اور اچھی طرح جھنجھوڑ کر جگانے کے لیے کہا جا رہا ہے لیکن ایک لفظ تو لگانے سے مطالب اور مفاہیم کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا کا مطلب یہ ہے کہ شور قیامت کا ہماری طرف سے ہماری راہ سے گذرنا یقینی نہیں ہے۔ بلکہ قدرت نے دنیا میں ہماری اہم ذمہ داریوں اور خاص فرائض کے سرانجام دینے کی وجہ سے ہم پر خاص عنایت فرمائی ہے اور قیامت کے وقت اٹھنا اور جاگنا ضروری نہیں قرار دیا کہ جس عرصے میں دنیا کے سب لوگوں کا حساب کتاب ہوگا اتنے عرصے تک ہمارے لیے قیامت کو ٹال دیا ہے۔ ہمارے لیے اب الگ قیامت برپا کی جائے گی۔ وہی بات کہ یہ قدرت نے دنیا میں اہم کارگذاریوں کے باعث ہمیں رعایت دی ہے۔

مگر شعر زیر بحث کے پہلے مصرع میں جو شور قیامت سے درخواست کی گئی ہے۔ ''اے شور قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں'' تو اس سے ہمارے سچے فرمانبردار ہونے کا پتا چل رہا ہے کہ خواہ ہم پر قدرت نے قیامت کے دن سب کے ساتھ جاگ اٹھنے کی ذمہ داری عائد نہیں کی لیکن ہمیں پھر بھی خیال ہے کہ ہم کیوں نہ سب کے ساتھ ہی اپنا حساب کتاب پورا کریں۔ اس کے علاوہ ''سوتے ہی نہ رہ جائیں'' سے یہ بھی پتا

چل رہا ہے کہ ہم اپنے پر کڑی تنقید کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ہوسکتا ہے ہم اپنی انسانی کمزوری کے تحت سوتے ہی نہ رہ جائیں اس لیے شور قیامت سے درخواست کی جارہی ہے کہ تیرا گذر جب بھی ہو ہمیں جگانے کے لیے تو خاص اہتمام کرنا وہی بات کہ کہیں ہم اپنی انسانی فطرت کی کوتاہی کا شکار ہو کر سوتے ہی نہ رہ جائیں۔

غرض آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شعر زیر بحث میں ایک لفظ ''تو'' نے کیسے کیسے عمدہ نکات اور معانی کے لیے باب ہائے فکر وا کروئے ہیں۔ اور کس طرح میر صاحب اپنے عجز وانکسار کا حوالہ بھی دے رہے ہیں۔ ایک بلند نگاہ انسان کے عجز وانکسار کا حوالہ بھی دے رہے ہیں ایک بلند نگاہ انسان کے عجز وانکسار کا حوالہ جو ہمیشہ انسانیت کو اس کے عروج پر پہنچانے کی ضمانت بنتا رہا ہے۔

دہر میں قیام وخرام کی صورتیں

اس دنیا میں ہم کتنی دیر ٹھہرتے ہیں اور پھر کس طرح چلے جاتے ہیں؟ یہ سوال یوں تو اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے لیکن چونکہ آنا جانا آئے دن لگا رہتا ہے اس لیے معمول ہونے کے باعث اس کی اہمیت پر لوگ بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ میر صاحب کی دو غزلیں ہیں جو الگ الگ قیام وخرام دہر سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں ذیل میں ان دونوں غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار پر کچھ عرض کروں گا۔ پہلے قیام سے متعلق غزل پر اور وہ غزل اس مطلع سے شروع ہوتی ہے۔

آجائیں ہم نظر جو کوئی دم بہت ہے یاں
فرصت ہمیں بسانِ شرر کم بہت ہے یاں

مضمون بہت فرسودہ ہے لیکن ردیف ''بہت ہے یاں'' نے اس مضمون میں ایک تازگی پیدا کر دی ہے اور غور وفکر کی راہ بھی کھولی ہے۔ ٹھیک ہے یہ دنیا بذاتِ خود فانی ہے اور اس فانی دنیا میں تھوڑی دیر کا قیام بھی بہت معنی رکھتا ہے اس لیے کہ فنا میں بقا کا ظہور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا کو صرف فانی ہی مت سمجھو اس میں جو بقا کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ فنا میں بقا کی یہی نمود اس فنا کو بھی بقا کی ایک نئی صورت دینے کا ارادہ رکھتی ہو۔ اس شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع میں جو کہا گیا ہے فرصت ہمیں بسان شرر کم بہت یاں بظاہر تو اس کا مطلب یہی نظر آتا ہے کہ ہمیں اس دنیا میں ایک چنگاری ایک شرر کے مانند اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا موقع میسر آتا ہے لیکن ذرا غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ

شرر کی نمودیوں تو بہت تھوڑی ہوتی ہے لیکن اس میں تمام دنیا کو روشن کر دینے کے امکانات بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ایک چنگاری سے سارا جہان بقعۂ نور بھی بن سکتا ہے اور جل کر خاک بھی ہوسکتا ہے۔ اب یہ تو اپنی اپنی مثبت اور منفی سوچ پر منحصر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی تھوڑی سی زندگی کو حقیر اور کم نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس تھوڑی سی زندگی میں آدمی بہت کچھ کرسکتا ہے۔ اس طرح بہت کچھ گنوا بھی سکتا ہے۔ کھونا اور پانا بڑی حد تک انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ دیکھنے کی بات تو یہ ہوتی ہے کوئی کس طرح پاتا ہے اور اسی طرح کوئی کس انداز میں گنواتا ہے...... اس کے علاوہ پانا اہم بھی ہوسکتا ہے اور غیر اہم بھی۔ اسی طرح کھونا اہم بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور غیر اہم بھی......

کھونا اور پانا دونوں عمل ہی اپنی اپنی جگہ ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ اس حیثیت کی قدر و قیمت کو متعین کرنا ہر انسان کے اپنے رویے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح یہاں کھونا پانا اپنی اپنی جگہ اہم ہیں اس طرح یہاں تھوڑا وقت اور زیادہ وقت بھی کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک انسان اس طرف توجہ نہیں کرتا...... اس غزل کا دوسرا شعر یہ ہے۔

حاصل ہے کیا سوائے ترائی کے دہر میں
اٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں

میں اس شعر کی تفہیم اور تجزیہ الگ اس عنوان کے تحت کر چکا ہوں "ایک عام لیکن نیا تجربہ"...... وہاں تفصیل سے اس شعر کے بارے میں میری معروضات ملاحظہ فرمایئے۔ یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس شعر میں شبنم یعنی اوس سے متعلق بالکل ایک نیا تصور پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ تجربہ عام ہے لیکن غزل میں شاید کبھی اس طرح قلمبند نہیں ہوا۔ تیسرا شعر اِبروئے یار سے تعلق رکھتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

مائل بہ غیر ہونا تجھ ابرو کا عیب ہے
تھی زور یہ کماں ولے خم چم بہت ہے یاں

چہرے پر ابرو کی اہمیت بھی کوئی کم نہیں۔ ان کی ذرا سی حرکت ذرا سی جنبش ہزار ہا معانی کی حامل ہوسکتی ہے۔ چہرے پر ابروئے یار کو حرکت یا جنبش کیا ہوتی ہے کہ

عاشق کی دنیا میں ایک ہلچل مچ جاتی ہے۔ یوں تو ابرو ہمیشہ ہی مائل بہ کرم رہتے ہیں ان
کی بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے لیکن ان کا غیر کی طرف مائل بہ کرم ہونا عیب کی بات ہے۔
کیونکہ مائل بہ کرم ہونا اسی کی طرف اچھا لگتا ہے جو اس کا اہل ہو دوسرے مصرع میں پھر
ابروؤں کی ساخت اور بناوٹ کی طرف سنسنی خیز اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک
نہیں کہ یہ کمان ابرو اپنی جگہ بہت مضبوط ہے۔ وہ یوں کہ اس کا چلانا یا چلنا تو بڑی بات
ہے اس کو دیکھ کر ہی آدمی کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ مگر اس کمان ابرو کا سنبھالنا بھی
کوئی آسان کام نہیں۔ اس کی تمام تر مضبوطی کے باوجود اس میں لچک بھی بلا کی ہے۔
یہاں آ کر بڑے بڑے معشوقوں کا ایک طرح امتحان سا ہو جاتا ہے کہ وہ اس کمان کے
خم سے اور اس کی لچک سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہم اگر ذرا توجہ سے کام لیں تو اس شعر میں بہت ہی لطیف نکتہ یہ پیدا ہو
رہا ہے کہ ہماری یہ زندگی بھی معشوق کے کمان ابرو کی طرح ہے اپنی جگہ ٹھہری ہوئی بھی
نہایت حسن و جمال کے ساتھ اور اسے ہم حرکت میں بھی لا سکتے ہیں لیکن اسے حرکت
میں لانے کے لیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہم اپنی زندگی کی کمان ابرو کو کس کی طرف لے
جا رہے ہیں۔ کسی اہل کی طرف یا نا اہل کی طرف........... دیکھا میر صاحب کیا قیامتیں
برپا کرتے ہیں...... اب اس کے بعد غزل زیر بحث کا چوتھا شعر آتا ہے۔

ہم رہروانِ راہِ فنا دیر رہ چکے
وقفہ بسانِ صبح کوئی دم بہت ہے یاں

تصوف کی اصطلاح میں فنا کے معنی آپ جانتے ہی ہیں کسی بھی برائی کو کسی
بھی ظلمت کو دور کرنا۔ اب شعر کی تفہیم کی طرف آئیے۔ شاعر ہم انسانوں کے عرصہ
حیات کے بارے میں ہماری ہی زبانی کہہ رہا ہے کہ ہم راہِ فنا کے مسافر یعنی دنیا سے
اندھیروں کو مٹانے والے لوگ کافی عرصہ اس دنیا میں قیام کر چکے اچھے لوگوں کا قیام تو
صبح کی طرح تھوڑی دیر کے لیے بھی بہت ہوتا ہے کہ صبح ذرا سی دیر کے لیے آتی ہے
اور پھر اس کے بعد دنیا میں اجالا ہی اجالا ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے سارے دن

کے لیے......مطلب یہ ہے کہ اچھے کام کرنے والے کے لیے لمبی یا چھوٹی عمر کی قید کوئی معنی نہیں رکھتی......اس دنیا میں قیام کا مطلب کچھ کر گذر جانا ہے۔

اس غزل کا پانچواں شعر بھی خوب ہے۔اور بہت مشہور بھی ہے۔

اس بت کدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورتِ آدم بہت ہے یاں

یہاں دنیا کو بت کدہ کہا گیا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ آدم کی شکل وصورت کے لوگ تو بہت ہیں لیکن آدم کی طرح غور وفکر کرنے والے سمجھنے والے افراد کا قحط ہے۔ بتوں کو بھی تو برا اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ آپ کی کوئی بات نہیں سن سکتے آپ کو کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ ایسی صورت میں سوچنے کی بات ہے ان کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ اس شعر میں میر صاحب نہ صرف بت پرستی کی نفی کر گئے ہیں ایسے انسانوں کو بھی شدت کے ساتھ برا کہہ گئے ہیں جو سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ اپنی عقل کو کام میں نہیں لاتے۔ اس شعر میں لطیف نکتہ یہ نکل رہا ہے کہ ہم بتوں کو اور بت پرستی کو تو برا کہتے ہیں لیکن چلتے پھرتے بتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے بت اس اعتبار سے پھر بھی غنیمت ہیں کہ انہیں دیکھ کر ہم کوئی دھوکا نہیں کھاتے وہ تو ہیں ہی بت......اب یہ پھر ایک الگ صورت حال ہے کہ ہم جانتے ہوئے بھی ان پتھر کے بتوں سے اپنی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ گویا انسان کی گمراہی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ جہاں چاہے بھٹک سکتا ہے اور اگر ایک دفعہ بھٹک گیا تو پھر اس کو روکنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا......ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو میر صاحب اس بھٹکنے کی بھی ناکہ بندی کر رہے ہیں لیکن بڑے لطیف انداز میں یعنی بتوں کو یا بت پرستی کو برا بھلا کہنے کے بجائے چلتے پھرتے بتوں یعنی عقل سے کام نہ لینے والوں کی مذمت کر رہے ہیں۔اس سے اگلا شعر بھی بہت معنی خیز اور مزیدار قسم کا ہے۔ سنئے۔

اعجاز عیسوی سے نہیں بحث عشق میں
تیری ہی بات جان مجسم بہت ہے یاں

میر صاحب اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہیں اور فرما رہے ہیں کہ اے محبوب اگر میں نے تمہیں یہ کہا ہے کہ تمہاری باتوں میں بہت اثر ہے ان سے مردے بھی زندہ ہوسکتے ہیں تو یہ میں نے کوئی مبالغہ نہیں کیا۔ عشق میں محبوب کی ذات کے سوا کوئی دوسری ذات عاشق کو ایسی نظر نہیں آتی جو معجزے دکھانے میں محبوب سے بڑھ کر ہو خواہ وہ حضرت عیسیٰ کی ذات کیوں نہ ہو۔ عاشق کو تو اپنے معشوق کی ذات ہی میں سارے معجزے نظر آتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عاشق کو اپنے عشق میں اتنی قوت اور توانائی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی ذات کو روح اور بدن کے فرق سے بھی بلند کر دیتا ہے۔ یعنی عاشق اپنے محبوب کی ذات کی اتنی تنزیہہ کر لیتا ہے اور اسے اتنا لطیف بنا دیتا ہے کہ پھر معشوق صرف جان ہی جان رہ جاتا ہے گویا ایک طرح اس کا بدن کی کثافتوں سے تمام کا تمام تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کو معشوق کی ذات میں عشق کے حوالے سے ہر بلندی ہر رعنائی اور جلال و جمال نظر آتا ہے اب اسے کسی بلند ذات کے حوالے کی ضرورت نہیں رہتی...... میر صاحب اس شعر میں مشعوق سے زیادہ عاشق کے عشق کی کرامات کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ عشق خود ایک ایسا صاحب کرامات ہوتا ہے جو حسن کو اپنے سے بڑھ کر صاحب کرامات بنا دیتا ہے۔ اور یوں پھر معشوق سے بڑھ کر کوئی بات اور کوئی ذات بڑی نہیں رہ جاتی۔ میر صاحب کا اس سے اگلا شعر بھی جس طرح بہت خوب ہے اسی طرح مشہور بھی بہت ہے۔

عالم میں لوگ ملنے کی گوں اب نہیں رہے
ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں

یہ شعر ایک طرح کا نوحہ ہے عالم انسانیت کی اس صورت حال کا کہ قدرت نے ہر شخص میں بے پناہ صلاحتیں تو ودیعت فرمائی ہیں لیکن اکثر اپنی ان صلاحیتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے...... اس شعر میں لفظ ''اب'' اس شدت نوحہ کو مزید تیز کرتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ ان صلاحیتوں کو بھی عمل میں نہیں لایا گیا۔ ایسا ہوتا رہا ہے مگر اب روز

بروز لوگ اس طرف سے غفلت برتنے کے عادی سے ہو گئے ہیں۔ موجودہ زمانے میں تو خصوصیت کے ساتھ یہ شعر جدید سے جدید تر فلسفوں کی صورت حال کا نوحہ دکھائی دیتا ہے۔ ہر روز نیا سے نیا فلسفہ نیا سے نیا نظریۂ حیات ہمارے سامنے آ رہا ہے اور وہ انسان کو اس کے جانور پن ہی کی طرف مسلسل کھینچے چلا جا رہا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ اس صورت حال پر چیختے چلاتے بھی ہیں لکھتے لکھاتے بھی ہیں لیکن ایسا نظر آتا ہے جیسے ان کی اس چیخ پکار سے کوئی اثر نہیں ہو رہا..... شعر زیر بحث کا دوسرا مصرع تو انسان کی اس فکری صورت حال کو بڑے واضح انداز میں ظاہر کر رہا ہے۔ ''ہر چند ایسا ویسا تم عالم بہت ہے یاں'' یہ ایسا ویسا عالم ایسے ویسے نظریات ہی کا تو عالم ہے۔

اس غزل کا اب جو میں شعر پیش کر رہا ہوں وہ خصوصیت کے ساتھ اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ جو معنی مجھے اس شعر کے سمجھ میں آئے ہیں یقین نہیں آتا کہ میر صاحب کا مطلب بھی وہی ہو گا پہلے شعر ملاحظہ فرمائیے۔

دل مت لگا رخ عرق آلود یار سے
آئینے کو اٹھا کہ زمیں نم بہت ہے یاں

بھلا دیکھئے تو سہی یار کا رخ عرق آلود کس کو پیارا نہیں لگتا خواہ وہ بارش میں عرق آلود ہوا ہو یا عرق انفعال سے..... مجھ میں تو کسی طرح اتنی ہمت نہیں ہو رہی کہ یار کے رخ آلود کو رد کر دوں اور اپنے دل کے آئینے کو اس کے پاس سے اٹھا لوں کہ کہیں زمین کے بہت زیادہ نم آلود ہونے کی وجہ سے اس میں دھنس ہی نہ جائے۔ یقیناً میر صاحب یہ نہیں کہنا چاہتے ہوں گے۔ مجھے اپنی کم فہمی کا اعتراف ہے۔ میرا خیال ہے میر صاحب رخ آلود یار کو بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں اور اپنے دل کے آئینے کو بھی......

اور اب اس شعر کے بعد غزل کا مقطع آ رہا ہے۔ جس میں اس دنیا سے رخصت ہونے کی اپنی صورت حال کو میر صاحب بیان فرما رہے ہیں اور یہ عجیب اضطراب کا سا عالم ہے..... یہ مقطع اس طرح ہے۔

شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میر
احوال آج شام سے در ہم بہت ہے یاں

یہ رخصت کا منظر بھی ہوسکتا ہے اور اپنے اعضاء کی ناطاقتی کا اظہار بھی کہ درد و آلام کی کثرت ہے اور اُدھر اعضاء میں ان کو برداشت کرنے کی طاقت نظر نہیں آ رہی ہے۔ لیکن لفظ ''شاید'' سے پتا چل رہا ہے کہ شاید یہ ہمت پیدا ہو جائے اور طاقت بھی آ جائے کہ عمر بھر تو میر صاحب نے دکھ درد برداشت کیے آخر وقت میں قدرت ان میں طاقت کیوں نہ پیدا کرے گی۔ آدمی جب میر صاحب کی طرح مسلسل درد و الم کا شکار رہتا ہے اور ان کے ساتھ ساتھ اس میں یعنی آدمی میں ان درد و آلام کو برداشت کرنے کی بھی عادت سی پڑ گئی ہو تو پھر اس کی غیرت کسی طرح گوارا نہیں کرتی کہ اس آخری بار ہمت اور حوصلہ نہ دکھایا جائے۔ لیکن شاید کے بعد کی جو کیفیت شعر میں بیان کی گئی ہے اس سے تو یہی معلوم ہو رہا ہے کہ صورت حال کچھ زیادہ ہی خراب ہوگئی ہے۔ مگر وہی بات کہ لفظ ''شاید'' بار بار ہمیں شاعر کے حوصلے کی طرف توجہ دلا رہا ہے۔ اور امکان کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہونے کی نوید بھی سنا رہا ہے۔ ہاں اگر وقت ہی پورا ہوگیا ہے تو یہ ایک بالکل الگ بات ہے...... ورنہ میر صاحب اب بھی ہمت پیدا ہو جانے کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔

صورت خرام

- اس دنیا سے رخصت ہونے کے موضوع پر میر صاحب کی ایک مسلسل غزل ہے۔ میں یہاں اس غزل کا مطلع پیش کر رہا ہوں۔ یہ بھی بہت مشہور ہے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

بظاہر یہ مطلع عام سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ایک تو غزل کی پوری روایت

موجود ہے دوسرے اردو میں فقیر کے کچھ اور معنی لیتے ہیں ورنہ عربی کا یہ لفظ الفقر سے ہے جس کی نمایاں خصوصیت بے نیازی اور بے لوث ہونا ہے۔ چنانچہ میر صاحب کہہ رہے ہیں کہ میاں ہم فقیرانہ اس دنیا میں آئے یعنی بے لوث اور بے نیاز ہو کر اور اسی بے نیازی کے عالم میں یہاں سے رخصت ہو رہے ہیں لیکن ہم ایک صدا ضرور لگا کر جا رہے ہیں جو ہمارے بعد بھی فضا میں گونجتی رہے گی کہ زندگی گذارنے کا اصل مزا اصل لطف بے نیاز ہو کر اور بے لوث ہو کر زندگی گذارنے ہی میں ہے کیونکہ فقیری میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ صحیح معنی میں فقیر ہمیشہ سب کی خیر و عافیت اور بھلائی چاہتا ہے اور اسی ضمن میں وہ سب کے لیے دعا بھی کرتا ہے سو ہم بھی خیر و خوبی اور سب کے لیے سلامتی کی دعا کر کے رخصت ہو رہے ہیں...... دنیا سے رخصت ہونے کا فی الحقیقت یہی ایک اسلوب ہے جو آدمی کو اس کے بعد بھی زندہ و پائندہ رکھتا ہے...... ''کر چلے'' ردیف اس پوری غزل میں اس احساس کی حامل ہے کہ اپنی طرف سے جانے والے نے اپنے استطاعت کے مطابق جو سوچا تھا اس پر عمل کر کے رخصت ہو رہا ہے دوسرا شعر ہے۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

حقیقت پر مبنی شعر ہے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ حقیقت کو اپنے ایفائے عہد سے ملا رہے ہیں اے محبوب ہم نے یہی عہد کیا تھا کہ تمہارے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے سو دیکھ لو خواہ دیر ہی سے سہی اس عہد کو پورا کر کے جا رہے ہیں۔ جب تم نہیں ہو تو تنہا ہمارا جینا کیا معنی رکھتا ہے۔ پھر یہاں قافیہ نے ردیف سے مل کر کیسے تکمیل کا احساس دلایا ہے۔ اس پر سوچئے تو شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ تیسرا شعر ہے۔

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی
کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

شفا سے مراد یہاں کسی مرض سے صحت یاب ہونے کے معنی بھی لیے جا سکتے ہیں اور مرض ہجر سے شفا پانے کے معنی بھی لیے جا سکتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں شاعر

نے اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کی ہے۔ اگر وہ کوئی عام مرض تھا اس کے لیے ہم نے خوب دوا دارو کی علاج معالجے کرائے اور اگر یہ مرض ہجر تھا تو اس ضمن میں بھی پوری پوری کوشش کی گئی کسی طرح سے محبوب کا قرب حاصل ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی طرف سے کچھ کر گزرنے میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ دل اس بارے میں مطمئن ہے۔ اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت یہ احساس بہت ضروری ہے۔ زبان کے اعتبار سے تقدیر اور مقدور ایک ہی مادہ کے لفظ ہیں۔ وہی بات کہ قدرت نے جس قدر استطاعت ودیعت فرمائی تھی اس کا پورا پورا استعمال کیا گیا ہے...... اگر پھر بھی شفا نہیں مل سکی تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ اس میں بھی قدرت کی طرف سے کوئی بہتری ہی پوشیدہ ہے۔ انسان کی طرف سے تو یہی ہے کہ وہ مقدور بھر کوشش کرے سو وہ کی گئی پھر اطمینان سے رخصت کیوں نہ ہوا جائے۔ راضی برضا ہونے میں کوئی حسرت اور کوئی ارمان باقی نہیں رہا کرتا۔ اگر کوئی ایسی صورت کو حرمان و یاس کی صورت کہتا ہے تو یہ اس کے سمجھنے کا قصور ہے۔ اور عموماً میر صاحب کی اسی ادا کو نہ سمجھا گیا اور ان کے بارے میں کم نظروں کوتاہ بیں نقاد حضرات نے یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ میر تقی میر حزن و یاس کا شاعر ہے...... جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا گیا ہے راضی برضا ہونے کی کیفیت میں جو ایک خاص انداز کا وقیع اور بلند پایہ اطمینان پایا جاتا ہے اسے عام نگاہ جلدی سے مشاہدہ نہیں کر سکتی اور معاف کیجیے۔ ہمارے نقادوں میں اکثر کی نگاہ عامیانہ ہی رہی ہے۔ اس کے بعد چوتھا شعر ایک زبردست قسم کا شعر ہمارے سامنے آتا ہے۔

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے
ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے

اس شعر میں خصوصیت کے ساتھ قابل غور لفظ ''آہ'' ہے جب تک آپ اس پر توجہ کے ساتھ غور نہیں کریں گے شعر کی تفہیم پوری طرح نہ ہو پائے گی۔ ویسے تو واضح ہے کہ کوئی چیز ایسی ہے جس کے لیے دنیا کی ساری چیزوں سے جی بھر گیا ہے۔ مگر اس شعر میں شاعر نے جو آہ کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے پتا چل رہا ہے کہ یہ آہ بڑے درد

وکرب کی ساتھ بھری گئی ہے۔اس آہ میں دنیا والوں کی کم فہمی اور کم نگاہی کا رونا بھی ہے
اور اپنی کوتاہی کا احساس بھی کہ ہم ہی دنیا والوں کو اس چیز کی اہمیت کا احساس دلاتے
جس کے لیے ہم نے ساری دنیا کو تج دیا ہے۔مگر کوتاہی دونوں طرف سے ہوئی ہے نہ
دنیا والے ہی سمجھے اور نہ ہی ہم انہیں سمجھا سکے...... اس افہام وتفہیم کی نارسائی نے
دونوں ہی کو نقصان پہنچایا ہے۔ چنانچہ اس لفظ ''آہ'' میں اس نقصان کا کرب بھی موجود
ہے۔مگر اس شعر میں ایک تکمیل کا احساس ضرور ہے کہ کم از کم ہم نے ایک چیز کے لیے
دنیا کی دوسری چیزوں کی پرواہ نہیں کی...... ہمارے اس فیصلہ میں کچھ اور ہو یا نہ ہو
ہمارے فیصلہ کی محکمی اور پختگی ضرور ہے۔ جس کی وجہ سے ہم بہت ہلکے پھلکے بہت
ساری لطافتوں کے ساتھ رخصت ہو رہے ہیں۔اس غزل کا پانچواں شعر ہے۔

کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

اس شعر میں دو فیصلے ہیں ایک طرف ایک فیصلہ ہے تو دوسری طرف دوسرا
فیصلہ...... میر صاحب نے تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ محبوب سے ملنے کی اس کے ساتھ زندگی
گذارنے کی چونکہ کوئی امید نہیں اس لیے پہلے جو ہم محبوب پر اس خیال سے نگاہ کرتے
تھے کہ اس کے ساتھ ہم کیسی خوشرنگ ، خوش ترنگ اور خوش سلیقہ زندگی گذاریں گے اس
خیال کو ترک کر کے اب ہم محبوب کی صورت کو کسی امید کے بغیر دیکھنا چاہتے تھے کہ
دیکھیں اس سے کوئی امید وابستہ نہ رکھ کر پھر ہمیں وہ کیسا دکھائی دیتا ہے۔ہمارے اس
فیصلہ کا مقصد بہت بلند بہت ارجمند تھا کہ اس طرح ہم اپنے محبوب پر ایک وسیع نگاہ
ڈال سکتے تھے مگر ہمیں اپنے محبوب نے یہ موقع بھی نہ دیا آخری وقت میں اس نے ہم
سے منہ ہی چھپا لیا۔

اس شعر کے پہلے مصرع سے عموماً غلط معنی اخذ کرنے کا اندیشہ ہے۔لوگ سمجھتے
ہیں میر صاحب جو یہ فرما رہے ہیں ''کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ'' تو یہاں وہ کسی مایوسی کا
اظہار کر رہے ہیں۔کسی پر نا امیدانہ نگاہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس شخص سے

مایوس ہو گئے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس شخص کو بے لوث ہو کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ یعنی اپنی کسی طرح کی بھی امید سے اس کو علیحدہ کر کے دیکھنے کی خواہش کرنا اپنی جگہ ایک باوقار عمل ہے...... البتہ میر صاحب نے اس شعر کے دوسرے مصرع میں اپنے جس کرب کا اظہار کیا ہے اس کی تکلیف کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں...... دیکھئے کس درد کے ساتھ فرما رہے ہیں...... ''سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے''...... اس مصرع میں ''بھی'' کے چھوٹے سے لفظ نے کیا قیامت برپا کی ہے...... کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

اُف دیکھئے اس غزل کے چھٹے شعر نے کیا حشر کا منظر دکھایا ہے۔

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سویاں سے لہو میں نہا کر چلے

دیکھ لیجئے شاعر کے پہلے مصرع میں دل کی آرزومندانہ کیفیت کا اظہار جس طمطراق کے ساتھ صرف ایک لفظ ''بہت'' کے ذریعے سے ہوا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ شعر میں ایک ایک لفظ کس قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے۔ اسی پہلے مصرع کی نثر لفظ بہت کو الگ کر کے کیجئے تو میری بات آپ پر واضح ہو جائے گی۔ ''تیری گلی کی آرزو تھی'' کیا بات بنی کچھ بھی تو نہیں لیکن اگر ہم یوں کہتے ہیں ''بہت آرزو تھی گلی کی تیری'' تو ہمیں توقع ہوتی ہے کہ دوسرا مصرع ہمارے دل کی اس کیفیت کو خارجی دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرے گا کہ لوگوں کی چیخیں نکل جائیں گی چنانچہ دیکھ لیجئے دوسرا مصرع کیا حشر برپا کر رہا ہے۔ سویاں سے لہو میں نہا کر چلے پورا شعر لکھے دیتا ہوں تا کہ شعر کے پر تاثیر ہونے کا احساس سامنے آجائے۔

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سویاں سے لہو میں نہا کر چلے

اب اگر آپ اس شعر کو طنزیہ انداز میں پڑھتے ہیں تو اس کے معنی بڑے عام سے نکلتے ہیں کہ ہم عاشقوں کی بڑی خواہش تھی کہ کسی دن تیری گلی میں پہنچیں اور وہاں جا کر اپنے عشق کے اثر و رسوخ کا اندازہ لگائیں۔ لیکن وہاں پہنچے تو لوگوں نے ہمیں

لہولہان کر دیا...... لیکن اگر آپ اس شعر کو طنزیہ انداز میں نہیں پڑھتے اور لہو کو زندگی کی علامت سمجھتے ہیں تو پھر اس شعر کے معنی اپنے ان نکات سے مزین ہو کر کچھ اور ہی طرح طلوع ہوتے ہیں۔ یعنی اے محبوب ہمیں تیری گلی میں جانے کی شدید آرزو تھی سو جیسے بھی بنا ہم وہاں تک پہنچ گئے یوں تو ہمارا تیری گلی تک پہنچنا ہی بذات خود ایک بہت بڑی کامیابی کا حامل تھا لیکن تیری گلی میں پہنچ کر جو طرح طرح کے عالم ہم پر گذرے اور جن کے نتیجے میں ہم سر سے پاؤں تک خون میں ڈوب گئے یعنی سر سے پاؤں تک زندگی میں شرابور ہو گئے ہم اس کے لیے بھی نہ صرف تیرے بلکہ دنیا کے لوگوں کے بھی سپاس گذار ہیں۔ آخر اور کچھ نہ سہی تیری گلی کے ناسمجھ لوگوں نے ہمیں تیرا عاشق تو سمجھا......اور اگر تیری گلی کے لوگ ناسمجھ ہیں تو اس میں ان کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا کہ معاشرہ کے مقتدر افراد کا کہ انہوں نے ان کی اس جہالت کو دور کرنے کا تا حال کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔ ویسے آپ جانتے ہیں میر صاحب کو خون میں نہانے کی تو مشق بھی تھی اور حوصلہ بھی کیونکہ ان میں درد و آلام سے زندگی کا احساس تیز ہو جاتا تھا۔

اس غزل کا ساتواں شعر تو اور بھی ٹھاٹ کا شعر ہے اور اس سے پہلے یعنی چھٹے شعر سے تعلق رکھتا ہے ویسے بھی میں نے اس عزل کو مسلسل غزل ہی قرار دیا ہے۔ بہر حال ساتواں شعر ملاحظہ فرمایئے۔ اب تو اسے آپ نے لتا کی پرسوز آواز میں بھی سن لیا ہوگا۔

دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

اگر چہ اس شعر کی اپنی ایک الگ حیثیت ہے لیکن تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجئے کہ میر صاحب محبوب کی گلی میں تو آئے ہوئے تھے۔ جب محبوب کو اس کا علم ہوا تو اس نے بھی میر صاحب کو پورے ناز و ادا کے ساتھ اپنا جلوہ یا ایک جھلک دکھانے میں اگر اور کچھ نہیں ایک محبوبانہ تفاخر تو ضروری محسوس کیا ہوگا۔ چنانچہ محبوب میر صاحب کے سامنے اس ادا کے ساتھ آیا کہ ان کے رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے۔ مگر اس شعر میں

جو ''آپ سے جدا کرنے'' والی بات ہے اس عاشقانہ تنہائی کا بھی ابھی تک کوئی ساتھ نہیں دے سکا۔ شاید یہی وہ تنہائی ہے جو عاشق کو وصلِ محبوب سے بھی بلند کر دیتی ہے۔ لیکن اپنے آپ سے جدا ہونے میں جو ایک حسرت بھری کیفیت ہوتی ہے میر صاحب نے اس شعر میں اسے پوری طرح بیان کر دیا ہے۔ اور یہ لیجئے اس غزل کا آٹھواں شعر طلوع ہوتا ہے۔

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حق بندگی ہم ادا کر چلے

بظاہر یہ شعر بہت عام سا نظر آتا ہے اور عام ہے بھی کہ یہ مضمون اور خیال دونوں ہی اکثر شعرا نے اپنے شعروں میں قلمبند کیے ہیں۔ جبیں کا سجدہ کرتے کرتے چلے جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم نے اپنے غرور کو بالکل ختم کر دیا۔ اور بندگی کے معنی یہی ہیں کہ بندہ اپنے آقا کے سامنے اپنے غرور و تکبر کو بالکل ختم کر ڈالے۔ لیکن شعر زیر بحث کی ردیف نے یہاں ایک بالکل نئے معنی پیدا کر دیئے ہیں جس کی توقع بظاہر اس مضمون اور خیال میں ہرگز نہیں تھی۔ مطلب یہ ہے کہ جبیں سجدہ کرتے کرتے چلی گئی ختم ہوگئی مانتے ہیں مگر دوسرے مصرع میں جو کہا جا رہا ہے ''حق بندگی ہم ادا کر چلے''...... کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں یا یہ معنی پیدا نہیں ہو رہے ہیں کہ حق بندگی ادا کر کے جب آپ چلے ہیں تو دوبارہ ٹھہرے نہیں تسلیم کہ یہاں چلنے سے مراد ایک عمل کی تکمیل کرنے سے ہے مگر آپ چلنے کے عمل کو ہزار دوسرے معنی دیں اس کے لغوی معنی پھر بھی یہاں اپنا سر نکالے کھڑے ہیں اور یہی لغوی معنی ہمیں بتا رہے ہیں کہ بندگی کی تکمیل ایک حد تک ضرور ہوئی ہے لیکن کیا بندگی ایسا ہی کوئی محدود عمل ہے کہ جس میں امکانات کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ یک عاشق نے اپنے محبوب کا بندہ ہو کر ایک حد تک ضرور بندگی کا حق ادا کر دیا لیکن بندگی کی کوئی ایک حد ہم کیسے مقرر کر سکتے ہیں جبکہ ہم یہاں کسی شے کی بھی کسی معنی کی بھی کوئی حد مقرر کر ہی نہیں سکتے۔

آپ اس غزل کا نواں شعر پڑھیں گے تو میری تائید کریں گے کہ واقعی یہ

تمام غزل ایک مسلسل غزل ہے۔ تو نواں شعر یہ ہے۔

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

اب اگر آپ اس نویں شعر کو غزل کے تسلسل سے الگ کر کے پڑھیں گے تو یقیناً یہ شعر آپ کو بہت ہی روایتی انداز کا عام سا شعر نظر آئے گا۔ لیکن اگر آپ اس شعر کو ایک مسلسل غزل کا شعر تصور کریں گے تو پھر اس شعر کے یہ معنی نکل رہے ہیں جو یقیناً روایت سے ہٹ کر ہیں۔ یاد رہے کہ اس سے قبل کے شعر میں بندگی کی بات ہو رہی تھی۔ اور بندگی کو اس کی ایک آخری حد تک پہنچا دیا تھا۔ اب۔ اس مضمون کو آگے بڑھا کر نویں شعر میں شاعر ہمیں ایک عاشق کی حیثیت سے بتا رہا ہے، کہ اے محبوب ہم ایک ہی وقت میں تجھ سے پیار بھی کرتے تھے یعنی تیرے عاشق بھی تھے، اور دوسری طرف ہم اس ذات کو بھی نہیں بھولے تھے جس نے تجھ ایسے محبوب کو پیدا کیا چنانچہ پرستش ہم اس ذات کی کرتے تھے جس نے تجھے پیدا کیا اور عاشقی تجھ سے کرتے تھے کہ تو ہمارا معشوق تھا۔ مگر لوگ چونکہ عاشقی اور پرستش کے فرق کو نہیں سمجھتے اور عام لوگوں کی بات کیا ہے خاص لوگ بھی تا حال پرستش اور عاشقی کے دو الگ الگ تجربات کی حیثیت اور اہمیت کو نہیں سمجھ پائے۔...... کبھی ان خاص لوگوں کے نازک ہاتھوں سے عاشقی نکل کر پرستش میں جا شامل ہوتی ہے اسی طرح کبھی پرستش ان کے چکنے ہاتھوں سے پھسل کر عاشقی میں جا کر گڈمڈ ہو جاتی ہے۔

اور اسی کے باعث میر صاحب فرما رہے ہیں کہ ہم نے تو اپنی طرف سے اے محبوب تیرے پیدا کرنے والے کی پرستش کی اور تجھ سے عشق کیا لیکن لوگ سمجھے ہم تیری پرستش کر رہے ہیں لہٰذا یہ نا سمجھ لوگ اپنی دانست میں یہ سمجھنے لگے کہ جب میر تقی میر جیسا معتبر آدمی اس بت کی اس معشوق کی پرستش کر رہا ہے تو کہیں واقعی وہی خدا نہ ہو...... بت کہہ کر میر صاحب نے ایک طرح اپنے محبوب کو ہشیار کیا کہ تو ہم سے ایک بت کی طرح ہی پیش آتا رہا ہے۔ کیونکہ تو نے ہماری کبھی کوئی بات ہی نہیں سنی۔

دسویں شعر میں میر صاحب نے دنیا میں اپنے آنے اور جانے کی تصویر کشی کی ہے۔ اور بڑے ہی ٹھوس انداز میں کہ اس آنے جانے کا نقشا تصور سے بھی آگے بڑھ کر آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔

جھڑے پھول جس رنگ گلبن سے یوں
چمن میں جہاں کے ہم آکر چلے

ہم دنیا کے چمن میں آکر اس طرح رخصت ہوئے جس طرح پھول اپنی جڑ سے اپنی شاخ پر سے پتی پتی ہو کر جھڑتے ہیں...... اب میں کیا عرض کروں کہ میر صاحب نے اس شعر میں بھی محاکات کے کیا کیا کمال دکھائے ہیں...... پہلا کمال یہ کہ ''جہاں کا چمن'' کہہ کر دنیا کی رنگارنگی کو واضح کیا دوسرا کمال آدمی کے زندگی سے موت تک کے سفر کو پھولوں کے جھڑنے سے تعبیر کرنا یعنی اسی میں تیسرا کمال آدمی کے اعضاء اسی طرح تو کمزور پڑ کر اس سے جدا ہوتے ہیں جس طرح پتی پتی ہو کر پھول اپنی شاخ سے جھڑ جاتا اور جدا ہو جاتا ہے...... اب چوتھا کمال ملاحظہ ہو۔ پتی پتی ہو کر پھول کے اس جھڑنے کے عمل کو جب ہم اپنے اعمال اور اپنے اعضاء کے مقابلے میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ آدمی کی رخصت بھی اس دنیا سے اسی خوبصورتی کے ساتھ عمل میں آتی ہے اور ہاں اس کا ہر عضو پھول کی پتی کی طرح ہی ہوتا ہے اور مزید یہ کہ اس کے یعنی آدمی کے اعمال میں وہی نزاکت تو ہوتی ہے جو پھول کے جھڑنے کے عمل میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے غنچے سے پھول بننے کے عمل اور پھر پھول کھلنے کے عمل سے لیکر آخر جھڑنے کے عمل تک پورا نقشہ پوری تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

اور اب گیارہویں شعر کی باری آتی ہے۔ بہت نازک شعر ہے۔

نہ دیکھا غم دوستاں شکر ہے
ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے

اس شعر کی نزاکت کا ذکر بعد میں کروں گا پہلے اس شعر کے مضمون کے

بارے میں سن لیجئے۔ ہم میں سے کون ہے جو یہ نہیں چاہتا کہ سب دوست سلامت رہیں خواہ وہ خود پہلے کیوں نہ مرجائے۔ اس خواہش کو آپ کچھ بھی کہیں لیکن اس خواہش میں عام قسم کی خود غرضی ہرگز موجود نہیں ہے۔ کوئی شک نہیں کہ ایک طرح سے یہ بھی ہماری خود غرضی ہے کہ ہم دوستوں کے غم مفارقت سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس خود غرضی میں دوستوں کی زندگی کے خواہاں بھی تو ہم ثابت ہوتے ہیں...... اور اس شعر کی نزاکت یہ ہے کہ دوستوں کی موت کو غم کہا ہے اور اپنی موت کو داغ...... دوستوں کی زندگیاں صاف ستھری اور شفاف تعبیر کی ہیں اور اپنی موت کو داغ سے تشبیہ دے کر اپنے آپ کو شاعر نے گناہگار بنایا ہے اور یہ عجز وانکسار کا بہت ہی عمدہ اظہار ہے۔

اور اپنی زندگی اپنے دوستوں کی زندگی اور عام انسانوں کی زندگی کا ذکر کر کے آخر میں میر صاب اپنے فن کی بات کرتے ہیں...... بارہواں شعر ہے۔

گئی عمر در بند فکر غزل
سو اس فن کو ایسا برا کر چلے

میر صاحب عجز وانکسار سے بھرپور اپنے غم کا اظہار کر رہے ہیں کہ اگر چہ ہم نے اپنی تمام زندگی کو فن شعر گوئی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مگر اس تمام تگ ودو اس تمام جدوجہد کا نتیجہ کیا نکلا کہ جس طرح ہم چاہتے کہ اس فن شعر گوئی کو بلند سے بلند مقام پر لے جائیں تو ایسا کرنے کے بجائے اسے خراب کر کے جا رہے ہیں...... مگر ہزار عجز وانکسار کے باوجود شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع ہی میں جہاں یہ عجز وانکسار اپنے درجۂ کمال پر پہنچا ہوا ہے وہی ہمیں اس مصرع سے میر صاحب کی ایک دوسری قسم کی عالی ظرفی کا پتا چل رہا ہے جب ہم میر صاحب کے اس مصرع کو دہراتے ہیں ''سو اس فن کو ایسا برا کر چلے'' کہ میر صاحب تو یہ اعلان کر رہے ہیں کہ بھائیو میرا لحاظ بالکل نہ کرنا میں نے جتنی کچھ اور جس طرح کی شاعری کی ہے اسے اچھی طرح چھان پھٹک کر دیکھو ..... ورنہ ہم اپنے معیار تک فن شعر کو ہرگز ہرگز نہیں لا سکے۔

اور آخر کار مقطع میں تو عجز وانکسار کا یہ اظہار بہت ہی واضح ہو کر ہمارے

سامنے آتا ہے۔ جس کو ہم میر صاحب کے بہ حیثیت شاعر ہونے کے عجز و انکسار ہی سے تعبیر نہیں کرتے یہ تو ایک بہت ہی عالی حوصلہ بلند نظر، بلند مرتبہ انسان کے عجز و انکسار کا اظہار ہے۔ میر صاحب فرما رہے ہیں۔

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

میں مسمی مشکور حسین آخر میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ یہ خیال نہ لائیں کہ میر صاحب نے جو اپنے اکثر مقطعوں میں اپنے بارے میں اپنے فن کے بارے میں تعلّی فرمائی ہے وہ میری نظر میں نہیں ہے۔ اُن تعلّیوں کا اپنا ایک مقام الگ ہے۔ جو سیاق و سباق سے پوری طرح ہم پر واضح ہو جاتا ہے۔

جام پہ جام

میر صاحب کا ہر شعر ایک جام ہے۔ اور چونکہ اب میں آپ کی خدمت میں میر صاحب کے اشعار کو پے در پے اپنے معمولی سے تبصرے کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ اس لیے یہاں میں نے ''جام پہ جام'' کا عنوان رکھا ہے۔ بس یہ وہ شعر ہیں کہ سامنے آتے گئے اور میں لکھتا چلا گیا۔

میں اب میر صاحب کے ان اشعار میں سے جو مجھے خصوصیت کے ساتھ پسند آئے کچھ اشعار یہاں پیش کر رہا ہوں۔ ان میں سے ایسے اشعار بھی ہوں گے جو آپ نے پہلے سنیں ہوں گے اور ایسے بھی جو آپ کی نظر میں نہیں آئے ہوں گے۔ بہر حال میر صاحب کے یہ اشعار حاضر ہیں۔ ان پر میں نے اختصار کے ساتھ اپنا تاثر بھی بیان کیا ہے...... دیوان اوّل سے شروع کرتا ہوں اور پھر آخر دیوان تک میر صاحب کی غزل کو لے کر چلوں گا۔

مجلس میں رات ایک ترے پر توے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

جیومیٹری کی ٹھوس حقیقت والی صورت حال ہے کہ مثلث تین لفظوں سے وجود میں آتی ہے۔ اور یہی صورت حال ہمارے وجود کی ہے کہ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ذات اور غیر ذات کے ملنے سے کوئی بات بنتی ہے تو ہمارا یہ سوچنا غلط ہے۔ خالی شمع اور پتنگ یعنی پروانہ کے ہونے سے ان دونوں کا وجود بے حضور تھا یعنی تکمیل پذیر نہیں تھا البتہ جب ان میں تیسرا الوہی وجود شامل ہوا تو یہ دونوں بھی اپنے اپنے حضور میں

آجاتے ہیں۔ آج کے انسان کی سب سے بڑی مصیبت اور خرابی یہی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی ذات اور غیر ذات کائنات سمیت وجود کی تکمیل کے لیئے کافی ہیں۔ کسی تیسرے وجود کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے غریب بری طرح پریشان ہے۔ دیکھتے ہیں اب وہ تیسرے کو کب شامل کرتا ہے۔ یا خود کو مع دوسرے وجود تباہ کر کے دم لیتا ہے لیکن مطمئن رہیئے تیسرا وجود اسے ایسا نہ کرنے دے گا۔

O......O......O......O......O......O

جواب نامہ سیاہی کا اپنی ہے وہ زلف

کسو نے حشر کو ہم سے اگر سوال کیا

میر صاحب فرماتے ہیں کہ اگر قیامت میں ہم سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا اعمال نامہ سیاہ کیوں ہے تو ہم جواب دیں گے کہ ہمارے محبوب کی زلفیں چونکہ سیاہ تھیں اور ان کی سیاہی بلا کی ہمارے، دل کو بھاتی تھی اس لیے ہمارے اعمال نامہ میں سیاہی کا آنا تو بہت ضروری تھا وہ کیسے نہ آتی۔ لیکن ذرا سی توجہ سے اس شعر کا ایک لفظ ''اگر'' معنوی اعتبار سے شعر کو ایک دوسری ہی طرف لے جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میر صاحب کا یہ یقین کہ ان سے کوئی حشر کے دن ان کے اعمال نامے کی سیاہی کے بارے میں سوال ہی نہیں کرے گا اور اگر کسی نے ایسا کیا تو ہمارے پاس اس کا بڑا مضبوط جواب موجود ہے۔ گویا عاشقی میں کسی گناہ کے سرزد ہونے کا کوئی سوال ہی پیش نہیں آتا...... آپ نے ملاحظہ فرمایا جب تک ہم اس شعر کے لفظ ''اگر'' پر غور نہیں کرتے شعر کا معنوی اعتبار سے پوری طرح ابلاغ ہی نہیں ہوتا...... دیکھ لیجئے میر صاحب نے عاشقی کو گناہ سے پاک کر کے دکھا دیا ہے۔

O......O......O......O......O......O

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

یہ بہت مشہور شعر ہے لیکن اس شعر کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ اس دنیا میں

پھونک پھونک کر قدم رکھیں اور یوں اپنے آپ کو نکما اور ناکارہ بنا کر رکھ دیں۔ میر صاحب کا مطلب صرف اتنا سا ہے کہ آپ یہاں اس دنیا میں جو کام کریں آنکھیں کھول کر کریں۔ آپ آنکھیں کھول کر کام کریں گے تو احتیاط بھی خود بخود آپ کے برتاؤ میں آ جائے گی اور آنکھیں کھولنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے بعد آدمی زیادہ وثوق سے اور آزادی فضاء میں سانس لے کر کام کرتا ہے آہستہ سانس لینے کا مطلب یہی ہے کہ آپ کوئی کام بھی گھبرا کر اور ہانپتے کانپتے سرانجام نہ دیں۔ اس طرح اس کائنات میں جو معنوی نزاکتیں پائی جای ہیں اور ان نزاکتوں میں جو ایک استحکام موجود ہے آپ اس سے پوری طرح مستفید ہو سکیں گے۔

O......O......O......O......O......O

میر صاحب کا ایک عجیب سا شعر ملاحظہ فرمایئے۔

بدر ساں اب آخر آخر چھا گئی مجھ پر یہ آگ
ورنہ پہلے تھا مرا جوں ماہِ نو دامن جلا

اس شعر کا عجوبہ یہ ہے کہ عشق کی آگ کو میر صاحب چودھویں رات کے چاند سے تشبیہ دے رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ آتش عشق میں پہلے میرا دامن ماہِ نو کی طرح سے جلا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ آگ بدر ساں یعنی بدر کی طرح چھا گئی میں اس عشق کی آگ میں پہلے تو صرف ماہِ نو کی طرح نظر آتا تھا اب بدر یعنی چودھویں رات کا چاند نظر آ رہا ہوں...... عشق کی آگ خواہ کتنی بھی جلا دینے والی ہو لیکن ایک تو عاشق کو وہ ایسی محسوس ہو گی جیسے چودھویں رات کے چاند کی چاندنی ٹھنڈی اور کیف آور ہوتی ہے دوسرے عشق کی آگ سے دنیا میں روشنی پھیلتی ہے یہ آگ اپنی تاثیر میں دوسروں کو خوشگوار قسم کی روشنی یعنی چاندنی فراہم کرتی ہے اور بہت سے اندھیروں کو دور کرتی ہے۔

O......O......O......O......O......O

ایک اور شعر سنیئے۔

یوں گئی قد کے خم ہوئے جیسے
عمر اک رہرو سرِ پل تھا

میر صاحب اس شعر میں تشبیہ و استعارے کا ایک کمال یہ دکھا رہے ہیں کہ بڑھاپے میں جو آدمی کا قد خم ہو جاتا ہے تو اس کی تصویر ایک پل کی سی بن جاتی ہے۔ لیکن جیسے ہی آدمی کا قد خم ہوتا ہے یعنی پیکر انسانی کا جو ایک پل تیار ہوتا ہے تو فوراً ہی آدمی کی عمر بھی اس سے گذر جاتی ہے تمام ہو جاتی ہے۔ میر صاحب نے نتیجہ یہ نکالا اور دیکھئے کیا چپکے سے نکالا لیکن غور کیا جائے تو یہ نتیجہ اتنا چپ کا نہیں خاصا بولتا ہوا بھی ہے کہ آدمی مر جاتا ہے لیکن آدمی کی عمر جاتی تو ہے آدمی کی جان نہیں مرتی وہ تو گوشت پوست کے اس ڈھانچے کو چھوڑ کر کہیں دور چلی جاتی ہے اور یہ ڈھانچہ یہ پل کھنڈر سمجھ کر ایک طرف کر دیا جاتا ہے۔ بہر حال کچھ بھی کہیے میر صاحب آدمی کے بالکل فنا ہونے کے قائل نہیں ہیں ۔ بس آدمی کو اس کے پیکر کے پل سے گذار دیتے ہیں۔۔۔ اور پھر اس کی خریت کے طالب ہو جاتے ہیں ۔ ۔جیسا کہ اس شعر سے بھی ظاہر یہی رہا ہے لیکن ذرا غور کرنے سے......

O......O......O......O......O......O

اور یہ تو میر صاحب کا بہت ہی مشہور شعر ہے۔

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

بات یہ ہے کہ حسن ہی آپ کو سرمست و سرشار نہیں کرتا اور کر سکتا آپ بھی اس کو اسی طرح مست و سرشار کر سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا شعر میں میر صاحب نے اس حقیقت کو کس خوبصورتی اور بلاغت سے بیان فرمایا ہے اور پھر اس شعر مس خوبی معنی کا آبشار بھی جاری کر دیا...... حسن تعلیل کو کس فن کارانہ انداز میں استعمال فرمایا ہے کہ دوشیزہ معنی مجسم ہو کر ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی..... شمع کی لو تو ہوا سے ہلتی ہے جسکو میر صاحب نے بتایا کہ ہوا سے نہیں یہ تو پروانے نے شمع کے کان میں کوئی ایسی عمدہ بات

کہہ دی ہے کہ جس کو سن کر وہ وجد میں آ گئی اور اپنی زندگی کے آخری لمحے تک وہ اس طرح سرشاری کے عالم میں سر کو دھنتی رہی...... مطلب یہ ہے کہ دوسرے کی زندگی کو رعنائی اور سرمستی و سرخوشی سے ہم میں سے ہر کوئی سرسبز و شاداب اور معمور کر سکتا ہے۔ اس میں حسن یا عشق کی بات نہیں وہ کوئی عاشق ہو یا کوئی معشوق اور یا کوئی اب پ ہر فرد بشر میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے ابنائے جنس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر ڈالے۔

O......O......O......O......O......O

آدمی کے چہرے کے خدوخال پر غور کریں تو یوں لگتا ہے ایک ایک خدوخال کو بنانے میں قدرت نے بے شمار نزاکتوں سے کام لیا ہے۔ اور یہ نزاکتیں کہیں کہیں تو بہت ہی کڑے مراحل سے گذرتی محسوس ہوتی ہیں۔ میر صاحب کا ایک شعر ہے۔

کیونکہ نقاش اِزل نے نقش ابرو کا کیا
کام ہے اک کھینچنا رخ پر ترے شمشیر کا

نزاکت ابرو کی اس سے عمدہ تعریف کوئی کیا کر سکتا ہے۔ شمشیر سے تشبیہ دے کر میر صاحب نے ابرو کے سارے پھیکے پن کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ اور محبوب کے چہرے پر معمولی سی خراش تک نہیں آنے دی۔ میر صاحب خود بھی حیران ہو رہے ہیں اور ہمیں بھی حیران کر رہے ہیں کہ ابرو کا نقش نقاش ازل نے کیونکہ یعنی کس طرح کھینچا کہ یہ کام تو ایسا تھا جیسے محبوب کے چہرے پر تلوار کو کھینچ دیا ہو۔ شمشیر کا کھینچنا اور وہ بھی محبوب کے چہرے پر کوئی معمولی کام تھا کیا؟ بس یہ کام نقاش ازل ہی کر سکتا تھا...... اور اب اس شمشیر سے قتل ہم ہو رہے ہیں۔ کہ جب محبوب کے چہرے کی طرف دیکھتے ہیں ابرو کی شمشیر ہمیں قتل کر دیتی ہے اور دوبارہ زندہ ہو کر بلکہ پہلے سے زیادہ زندہ ہو کر دوبارہ محبوب کا چہرہ دیکھتے ہیں دوسری بار پہلی بار سے زیادہ شدت سے قتل ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

O......O......O......O......O......O

برقع اٹھا تھا رخ سے مرے بدگمان کا
دیکھا تو اور رنگ ہے سارے جہان کا

کسی کے بارے میں برا سوچنا یا برا سمجھنا کسی طرح سے بھی ٹھیک نہیں خواہ وہ کوئی حسین برا سوچے یا کوئی عاشق ذرا سی بدگمانی سے کام لے ایک شخص کے لیے ساری دنیا ہی بدل سی جاتی ہے اسی طرح وہ ذرا سی بدگمانی دور ہو جائے تو پوری زندگی کی فضا خوشگوار اور منور بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن میر صاحب نے جو مندرجہ بالا شعر کے دوسرے مصرع میں ارشاد فرمایا ہے ''دیکھا تو اور رنگ ہے سارے جہان کا'' اس سے پتا چلا کہ ساری بدگمانی رخ سے برقع نہ اٹھنے تک تھی۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا محبوب کا بدگمان ہونا بھی ایک لطف دے رہا تھا برقع اٹھا تھا رخ سے مرے بدگمان کا محبوب کو مرے بدگمان کہنے میں جو ایک اپنایت ہے اس کا بھی کوئی جواب نہیں۔

O......O......O......O......O......O

دل نے ہم کو مثال آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا

ہمارے دل نے ہماری ذات کو ہمیشہ اتنا صاف ستھرا رکھا کہ اس میں یعنی ہماری ذات کے آئینے میں ہمیں ایک عالم کے ساتھ روشناس ہو گئی...... کیا چیز تھی جو ہماری ذات کے آئینے میں منعکس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ہمارے دل کی وجہ سے تھا۔ ہماری محبت تھی جو ہمیں ایک دنیا سے روشناس کرا رہی تھی............

خوب دریافت جو کیا ہم نے
وقت خوش میر نکہت گل تھا

دیکھ لیجئے میر صاحب نے آپ کو ایک بہت ہی کام کی چیز بتادی جس کو انہوں نے ایسے ہی جلدی سے آپ کے سپرد نہیں کر دیا۔ بلکہ بڑی پوچھ کچھ دریافت اور تفتیش اور تحقیق کے بعد آپ کو بتا رہے ہیں کہ اچھا وقت پھول کی ایک خوشبو کی طرح ہوتا ہے۔ اچھا وقت یونہی راستے میں پڑا نہیں مل جاتا کوئی پھول کھلتا ہے تو وہ خوشبو کی

صورت میں اچھے وقت کو آپ کے سپرد کرتا ہے..... اچھے وقت کو سنبھالنا اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اس سے لطف اندوز ہونا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں اچھے وقت کی قدر و منزلت کے لیے آدمی کو بہت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ اچھے وقت کو خوشبو سے تشبیہ دینا ایک نادر چیز ہے۔

O......O......O......O......O......O

ابروئے کج ہے موج، کوئی چشم ہے حباب
موتی کسی کی بات ہے سیپی کسی کا گوش

یہ لیجیے سارے سمندر کو محبوب کے خط و خال سے بھر دیا۔ موج کو ابروئے کج کہا حباب کو آنکھ کہہ دیا۔ کسی کی بات کو موتی قرار دے ڈالا۔ سیپی کو کان سے تشبیہ دے دی..... گویا ساری کائنات آدمی کے خدوخال کا صدقہ ہے..... کوئی صورت کوئی ہیئت ایسی نہیں جہاں آدمی کے خدوخال اپنی سوغات نہ لٹا رہے ہو..... یا پوری کائنات آدمی کے خدوخال کی نقل کرنے میں مصروف ہے..... اور کائنات کی مصروفیت بھی کیا ہے یہی محبوب کے کسی نہ کسی خدوخال میں خود کو ڈھالنے کی ایک ناکام یا شادکام کوشش..... اس زمین میں میر صاحب کا یہ مطلع بھی سن لیجیے۔

ہر جز رو مد سے دستِ و بغل اٹھتے ہیں خروش
کس کا ہے راز بحر میں یا رب کہ یہ ہیں جوش

O......O......O......O......O......O

میر صاحب کو ہمارے نقاد ایک زمانے تک حزن و یاس اور غم و اندوہ کا شاعر کہتے رہے اور اسی مناسبت سے انہیں ایک طرح جبریت کا شاعر بھی کہا گیا۔ لیکن ان کا ایک شعر سنیئے اور پھر دیکھئے کس نئے انداز سے انسان کے اختیار کی بات میر صاحب کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ
عالم آئینے کے مانند در باز ہے ایک

اس عالم کو یعنی اس دنیا کو میر صاحب ایک کھلے دروازے سے تشبیہ دے کر فرما رہے ہیں دیکھو میاں آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ جو شکل بنا کر بھی اس دنیا میں آئیں گے آپ کو اسی طرح اس میں قبول کیا جائے گا کیونکہ دنیا کا یہ دروازہ ایک آئینے کی طرح کھلا ہوا ہے۔ اس پر غور فرمایئے اس شعر میں میر صاحب نے انسان کے اختیار کی نئی شکل پیش کی ہے۔

O......O......O......O......O......O

دیکھئے کیا خوبصورت اور عمدہ چلتی پھرتی ایک تصویر بنتی ہے کہ میر صاحب ایک سفر پر نکلے گھر سے تو تنہا چلے تھے کچھ دور بھی نہ آئیں ہوں گے کہ ایک حسین ملا جو بڑی نرالی چال کے ساتھ چلا جا رہا تھا میر صاحب آگے کو بڑھے تو دیکھا اس ایک کے ساتھ پیچھے سے دو حسین اور شامل ہو لئے۔ ان کی رفتار بھی قیامت تھی۔ میر صاحب نے پھر قدم بڑھائے لیکن ان حسینوں کے ذرا قریب پہنچے تو پتا چلا دو چار حسین ان میں اور شامل ہو گئے ہیں۔ ان حسینوں کی رفتار کو دیکھ کر میر صاحب کا حال برا ہوا جا رہا تھا۔ کہ تھوڑی دور چلے تو مزید حسین لوگ ان میں شامل ہو لئے۔ ان کی رفتار پہلے حسینوں سے بھی زیادہ بانکپن لیے ہوئے تھی...... میر صاحب اپنی منزل بھول گئے۔ اور رستے ہی میں ان حسین لوگوں کے جھرمٹ میں جی ہاں قیامت کی چال چلتے ہوئے حسینوں کے اس جھرمٹ میں میر صاحب مارے گئے۔ دیکھ لیجئے میر صاحب کو عین غربت میں کیا خوبصورت موت آئی ہے۔ لیکن میر صاحب کے مرنے کی خبر وطن میں لے جانے کے لیے جس کو کہا گیا ہے وہ ایک پرندہ ہے کبک جس کی چال خود ایک مثال ہے۔ ظاہر ہے یہ پرندہ اڑ کر تو میر صاحب کے وطن جانے سے رہا...... اپنی چال ہی کے ساتھ مٹک مٹک کر میر صاحب کی اس خوبصورت وفات مسرت آیات کی خبر دے گا لہٰذا...... میر صاحب کا شعر سنئے اور سر دھنیئے ...... تھوڑی سی تعقید کو برداشت کر لیجئے۔

مارا گیا خرامِ بتاں پر سفر میں میر
اے کبک کہتا جائیو اس کے وطن تلک

دوسرے مصرع میں جو ایک مختصر سا جملہ آیا ہے ''کہتا جائیو'' اس کی داد نہیں دی

جاسکتی گویا میر صاحب کی خوبصورت وفات کی یہ خبر بڑی خوبصورتی کے ساتھ لہک لہک کر وطن تک پہنچے گی۔

O......O......O......O......O......O
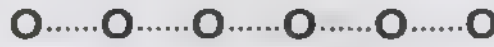
دو شعر لکھ رہا ہوں۔ پہلا شعر مطلع ہے دراصل یہ مطلع دوسرے شعر کے لیے آپ کو تیار کرنے کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف
تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

دوسرا شعر سنیئے خاصا مشہور شعر ہے۔

محبت نے شاید کہ دی دل میں آگ
دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

اس شعر میں مجموعی کیفیت اپنی جگہ لیکن پہلے مصرع میں لفظ ''شاید'' اور دوسرے مصرع میں ''دھواں سا'' قابل غور ہیں...... کہ ان الفاظ نے جو ایک تذبذب کی فضاء پیدا کی ہے اس کی وجہ سے شعر میں مزید وسعت پیدا ہوگئی ہے۔

O......O......O......O......O......O

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ویسے تو میر صاحب کا یہ بہت مشہور شعر ہے لیکن اس میں صرف یہی خوبی یا نکتہ نہیں ہے کہ بڑے انسان بہت دیر میں پیدا ہوتے ہیں بلکہ ایک طرح دیکھا جائے تو وقت کی یہاں اس طرح کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی انسان کا تاخیر سے پیدا ہونا اس کی کوئی خوبی نہیں ہے۔ اصل خوبی تو یہ ہے کہ بڑے انسان کی تخلیق میں زمین آسمان ایک ہو جاتے ہیں تب کہیں جا کر ایک انسان پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ایک اور نکتہ میر صاحب نے یہ بھی پیدا کیا ہے کہ صرف کسی بڑے انسان ہی کے لیے نہیں بلکہ ہر انسان کی تخلیق کے ضمن میں زمین آسمان کو ایک ہونا پڑتا ہے اور چونکہ ہر انسان اپنے خاص وقت پر پیدا ہوتا ہے اس لیے وہ دیر سے سے بھی پیدا ہوتا ہے گویا

تخلیقی عمل میں بڑا اور چھوٹا انسان برابر ہے۔ جس کے ایک معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ ہر انسان ایک بڑا انسان ہی ہوتا ہے بس کسی کو یہ توفیق حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے بڑے ہونے کے لیے صحیح خطوط پر عمل پیرا ہو جاتا ہے اور بہت سے انسان اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ توجہ دی جائے تو ہر انسان اپنی بڑائی کو دریافت کر سکتا ہے۔

O......O......O......O......O......O
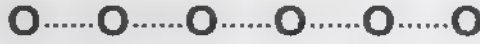
زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں

اس شعر میں ردیف کی بجہ سے نادانستہ طور پر ایک الجھن پیدا ہوتی ہے اور میں کی جگہ قاری خود بخود یہاں ''سے'' لگا دیتا ہے یعنی اس چمن سے بندھی مٹھی چلا جا...... گویا دنیا کے چمن میں اپنی ذات کو کھولنے کی ضرورت نہیں اس طرح تو کچھ دن زیادہ زندہ رہ سکے گا...... حالانکہ اس شعر کا واضح مطلب یہ ہے کہ اپنے منہ میں غنچے کی طرح زبان رکھ یعنی اپنے رنگ اور خوشبو کی حفاظت کر۔ رہا یہ سوال کہ اس دنیا کے چمن میں آتے ہوئے آدمی ہچکچاتا ہے تو اس ہچکچانے کی ضرورت نہیں جس حفاظت کے ساتھ تو پیدا ہوا اسی حفاظت کے ساتھ دنیا کے میدان عمل میں ڈٹ کر قدم رکھ...... باقی جب تو مناسب سمجھے اپنے رنگ و بو سے کام بھی ضرور لینا...... عموماً لوگ یا تو اپنی ذات کو کھولتے ہی نہیں عمر بھر ویسے ہی زندگی گذار دیتے ہیں جس طرح پیدا ہوئے تھے یا پھر اپنی ذات کو کھولنے میں لوگ جلدی کرتے ہیں جس کی وجہ سے اپنی ناپختگی کے باعث جلدی اپنے آپ کو ختم کر لیتے ہیں...... میر صاحب اپنے اس شعر میں زندگی سوچ سمجھ کر گذارنے کی تلقین کر رہے ہیں لیکن بہت ہی انوکھے طریقے سے......

O......O......O......O......O......O

رکھا کر ہاتھ دل پر آہ کرتے
نہیں رہتا چراغ ایسی پون ہیں

یہاں بھی میر صاحب احتیاط کے ساتھ زندگی گذارنے کی تلقین فرما رہے

ہیں۔ لیکن تشبیہ و استعارہ کی ندرت نے شعر کی صورتحال کو افسردہ یا غمگین دکھانے کے بجائے ایک حسن و جمال کی فضا مہیا کر دی ہے...... آہ کو ہوا سے تشبیہ دی ہے اور دل کو چراغ بتایا ہے۔ اور کہا ہے کہ آہ کرتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھنا ضروری ہے کہ آہ تو ایک ہوا کے جھونکے کی طرح سینے سے نکلتی ہے...... ہاتھ نہیں رکھے گا یعنی دل کو سنبھالے گا نہیں تو غم کے صدمے سے دل کا چراغ بجھ سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دکھ درد تو زندگی میں آیا ہی کرتے ہیں لیکن انہیں برداشت کرنے کے لیے نہ صرف ایک حوصلے کی ضرورت ہے بلکہ جمالیاتی حس کی بھی ضرورت ہے کہ اپنے غم کو انسان جس قدر حوصلے اور حسن و جمال کے ساتھ برداشت کرے گا اتنا ہی وہ غم ایک طاقت کی صورت میں بدل سکتا ہے۔ دیکھ لیجئے میر صاحب خود تو بلانوش یعنی دکھوں کو برداشت کر جانے والے تھے ہی اپنے قاری کو یہ تلقین کرنے سے باز نہیں آ رہے ہیں ... ویسے میر صاحب بات سولہ آنے کھری کرتے ہیں۔ درد و آلام کو نہ انہوں نے کبھی سر پر چڑھایا نہ اپنے ریختے میں اس کو کوئی بے جا اہمیت دی۔ درد و آلام کا مقابلہ کرنا انہیں بے جا اہمیت دینا نہیں ہے جتنا کہ درد و آلام سے دب جانا یا مرعوب ہو جانا انہیں بے جا اہمیت دینا ہے۔

O......O......O......O......O......O

یک بیاباں برنگ صوتِ جرس
مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی

اپنی بیکسی اور تنہائی کو میر صاحب نے ایک بیابان یعنی ایک لق و دق صحرا سے تشبیہ دی ہے اور پھر اس بیابان میں خالی پھیکی وسعت ہی نہیں ہے اس میں مسلسل ایک قافلے کے چلنے کے جرس کی آواز بھی آ رہی ہے...... گویا میر صاحب کی تنہائی اور بیکسی کیا ہے وسعتوں سے بھرپور شور ہے اور شور سے بھری ہوئی وسعتوں کا ایک سلسلہ جو چلنے کی خبر بھی دے رہا ہے...... اور کچھ ٹھہرنے اور قیام کرنے کی اطلاع سے بھی ہمیں تاریخ لکھنے کا احساس دلا رہا ہے...... میر صاحب کی تنہائی ایک تاریخ بھی ہے اور تاریخ ساز لمحہ بے کراں بھی۔

پیدا ہے کہ پنہاں تھی آتش نفسی میری
میں ضبط نہ کرتا تو سب شہر یہ جل جاتا

آدمی جب دکھ اٹھاتا ہے تو اس کے سانسوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سمجھدار آدمی اپنے دکھ درد میں نہایت صبرو ضبط سے کام لیتا ہے۔ میر صاحب اس شعر میں یہی بات کہہ رہے ہیں کہ میں نے اپنے دردوالم کو بڑے ضبط کے ساتھ برداشت کیا ہے اگر میں ایسا نہ کرتا تو میرے دکھوں کی آگ میں سارا شہر جل جاتا...... مطلب یہ ہے کہ حساس آدمی زندگی کے بہت سے دردو آلام کو خود اپنی ذات پر جھیل جاتا ہے اور دوسروں کو اس آگ سے بچاتا ہے ظاہر ہے کہ بہت ہی عمدہ اور انوکھا مضمون ہے جو اس شعر میں میر صاحب نے نہایت سادگی سے بیان فرمایا ہے۔

O......O......O......O......O......O

کم فرصتی جہاں کے مجمع کی کچھ نہ پوچھو
احوال کیا کہوں میں اس مجلس رواں کا

لوگ اکٹھے بھی ہوتے ہیں تو بھاگ دوڑ میں مطلب یہ ہے کہ آدمی کچھ اس انداز کا جلد باز واقع ہوا ہے کہ اسے ڈھنگ سے ابھی تک مل بیٹھنے کا سلیقہ بھی نہیں آیا ......اور اسی لیے وہ سماجی جانور ہونے کے باوجود ابھی تک صحیح معنی میں سماجی انسان تو کیا سماجی جانور بھی نہیں بن پایا۔ اپنی زندگی کے بہت سے وقت کو انسان ابھی تک بے سوچے سمجھے گذارنے کا عادی ہے۔ انسان کی اسی حقیقت احوال کو شعر زیر بحث میں میر صاحب نے بیان فرمایا ہے اور ''مجلس رواں'' کی ترکیب اس صورت حال کو نہایت خوبی سے بیان کر رہی ہے۔

O......O......O......O......O......O

تری چال ٹیڑھی تیری بات انوکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

آدمی کی سب سے نمایاں خصوصیات دو ہی تو ہین ایک قول دوسرے فعل اور میر اپنے بارے میں فرمارہے ہیں کہ اے میر تم چلتے ہو کوئی عمل کرتے ہو تو وہ بھی عام انداز میں سیدھے طریقے سے نہیں کرتے کوئی نہ کوئی ٹیڑھ اس میں ہوتی ہے اور اسی طرح کوئی بات کرتے ہو تو اس میں بھی کسی نہ کسی قسم کا نیاپن اور انوکھاپن ہوتا ہے اور اِدھر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ عام انداز کی بات اور عام انداز کے عمل کو تو تھوڑا بہت سمجھنے اور پہنچانتے بھی ہیں۔ عام ڈگر سے ہٹ کر ان بے چاروں کو نہ سوچنا اور بولنا آتا ہے اور نہ ہی یہ کوئی عام ڈگر سے ہٹ کر کام کر سکتے ہیں اسی لیے میر کو سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کی میر صاحب کا قول بھی جدا ہوتا ہے اور فعل بھی .....

O......O......O......O......O......O

شکر کر داغ دل کا اے غافل

کس کو دیتے ہیں دیدۂ بیدار

اصل میں ہر غم اور ہر داغ دل ایک طرح ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن ہم اپنی غفلت کی وجہ سے اس طرف توجہ نہیں دیتے...... توجہ نہ دینے والے کو اس شعر میں میر صاحب نے غافل کہا ہے...... اس شعر میں پیغام یہ ہے کہ اگر آدمی دیدۂ بیدار یعنی اپنی آنکھوں کو کھلا رکھے جاگتا رکھے تو اس کی زندگی میں بڑے سے بڑا غم روشنی بیداری اور تازگی کا سرچشمہ بن سکتا ہے اور اس میں جیب سے خرچ کچھ نہیں ہوتا وہی بات کہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی رنگ چوکھا آئے...... مطلب یہ ہے کہ کسی غم کے وقت اگر ہمت قائم رکھی جائے تو یہی غم ایک طاقت بن جاتا ہے...... اس شعر میں شکر کا لفظ اپنے اصل معنی میں آیا ہے یعنی کسی بات کو سراہنا Appreication یعنی اے غافل اگر تجھے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو اس پر غور کر اس کی اصل وجہ پر توجہ دے کیونکہ کسی کو اس دنیا میں داغ دل بھی آسانی سے نہیں مل جاتا...... کوئی دل پر داغ پڑتا ہے یا صدمہ پہنچاتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ دل کی آنکھ : بینائی اور نور بھی تو حاصل ہوتا ہے۔

O......O......O......O......O......O

میر کو واقعہ کیا جانیئے کیا تھا درپیش
کہ طرف دشت کے جوں سیل چلا جاتا تھا

میں اس شعر کو میر کا نمائندہ شعر اس لیے کہتا ہوں کہ میر صاحب درد و غم سے اتنے گھبراتے نہیں جتنا کہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں...... یہاں دشت سے مراد وہ صورتحال ہے جس کو درد و غم نے ویران کر دیا ہے لیکن میر صاحب اس کی ویرانی کو دور کرنے کے لیے اور اپنے آپ کو سرسبز و شاداب بنانے کے لیے اپنی پوری صلاحیت کار کے ساتھ مثل سیلاب جا رہے ہیں...... اور یہ عزم کیے ہوئے ہیں کہ دیکھتا ہوں یہ ویرانہ کب تک ویرانہ رہتا ہے اس کو سیراب کر کے باغ و بہار نہ بنا دیا تو بات ہے۔

O......O......O......O......O......O

مشکل بہت ہے ہم سا پھر کوئی ہاتھ آنا
یوں مارنا تو پیارے آسان ہے ہمارا

ہر کارآمد شخص یا کارآمد شے کا حاصل ہونا کوئی آسان بات نہیں ہے البتہ اس کارآمد شخص یا شے کو تباہ و برباد کرنا بہت آسان ہوتا ہے اور عموماً لوگ یہی کرتے ہیں خود انہی کے فائدہ کے شخص کو انہی کے فائدے کی چیز کو وہ خود ہی اپنے ہاتھوں سے تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں.......... دراصل ہر شخص اپنا فائدہ تو چاہتا ہے لیکن ایک عجیب نفسیاتی حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص اندر ہی اندر اپنے فائدے سے خوف زدہ بھی رہتا ہے کہ کہیں اس کا فائدہ خود اس کو ختم اور تباہ و برباد کرنے کا موجب نہ بن جائے.......... عجیب نفسیات ہے۔

O......O......O......O......O......O
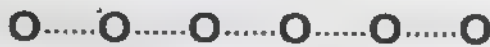
نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بہ کو تھا

جو شخص زندگی کو سمجھنا اور صحیح معنی میں اسے اپنے عمل میں لانا چاہتا ہے اسے

لوگ آوارہ سمجھتے ہیں کیونکہ وہ ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا...... اِدھر اُدھر چلنا پھرنا اس کی تلاش وجستجو کے لیے ضروری ہوتا ہے لیکن ایسی صورتحال میں آدمی کی صورت ایک کمزور سے غبار کی طرح ہو جاتی ہے...... بلکہ سچ پوچھا جائے تو چلتے پھرتے اور سوچتے سمجھتے ہوئے زندگی گذارنے والے شخص کو عام نگاہیں اچھی طرح دیکھ ہی نہیں سکتیں اور عام نگاہوں کی یہ کوتاہ بینی ہوتی ہے جس کی وجہ سے ایک رواں دواں شخص اُنہیں ایک آوارہ اور غبار سا دکھائی دینے لگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو غوروفکر اور عمل کے دوران میں دیکھنا ہر آنکھ کے بس کا روگ نہیں رہتا...... اس کے لیے خاص توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

O......O......O......O......O......O

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

O......O......O......O......O......O

میر صاحب اس شعر میں ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ مصائب تو خیر زندگی میں آتے ہی ہیں اور آدمی اپنی ہمت کے مطابق انہیں برداشت بھی کرتا ہے لیکن دل کا جانا یعنی عشق کا تجربہ ایک عجیب مصیبت ہے کہ جو کسی طرح بھی سنبھالے نہیں سنبھل رہی ہے۔ عشق خالی پھیکی مصیبت بھی نہیں ہے اس کے انوکھے پن کی وجہ سے ہم اسے مصیبت کہہ بھی سکتے ہیں لیکن وہی بات کہ اس تجربے کو آدمی بیان نہیں کر سکتا............ اصل میں عشق کے اسی انوکھے پن نے اس تجربے کو سانحہ بھی بنایا ہے۔ ورنہ عشق کو تو ایک روزمرہ کے واقعات کی طرح سے ایک واقعہ ہونا چاہیئے تھا کہ اس کے بغیر زندگی ادھوری رہتی ہے۔

O......O......O......O......O......O

رہے پھرتے دریا میں گرداب سے
وطن میں بھی ہیں ہم سفر میں بھی ہیں

یہ شعر میر صاحب کا بہت انوکھا شعر ہے وہ اس لیے کہ اس شعر میں میر صاحب نے وطن میں رہنے کے تجربے کو ایک نرالے انداز میں پیش کیا ہے جو سفر اور حضر کے تجربے کا ایک عجیب و غریب سا امتزاج ہے۔ وطن کو دریا کہنا اور وطن کی مصروفیات کو گرداب کا نام دینا ایک بہت ہی انوکھی تشبیہ ہے۔ آدمی اپنے آپ کو اپنے وطن میں کتنا بھی بیک وقت آرام وسکون اور تگ و دو کے عالم میں کہے وہ ایک طرح سے یعنی گرداب کی طرح خود بھی گھومتا رہتا ہے اور دوسروں کو بھی اپنے چکروں میں پھنسائے رکھتا ہے۔ عمرانیات کی یہ ایک بہت ہی عام لیکن اسی طرح بہت ہی خاص صورتحال ہے جس سے آدمی اپنے آپ کو الگ نہیں کرسکتا۔

بے ثباتی دنیا کا سفر ثبات آثار

ملاحظہ فرمائیے اپنے مندرجہ ذیل شعر میں میر صاحب کس طرح بے ثباتی دنیا کو ایک Dynamic حرکی اور فعال صورت دے کر اس کو ایک بہت ہی امکانات سے بھری چیز بنا دیتے ہیں۔

وہ شعر یہ ہے

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے

ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس شعر میں میر صاحب نے بے ثباتی کو ایک سفر سے تعبیر کیا ہے گویا ایک اعتبار سے یہاں کی کوئی چیز ختم ہونے والی نہیں بس آگے کی طرف بڑھنے والی ضرور ہے۔ اور پھر یہ آگے کی طرف بڑھنا بھی کوئی مصیبت یا مشکل اور کٹھن عمل نہیں کچھ اسی طرح کا عمل ہے جس طرح کسی پھو[illegible] اور خوشبو ایک

خاص وقت کے بعد اڑنے کے عمل سے دو چار ہوتے ہیں۔ اور یہ اڑنے کا عمل بھی ایسا ہے جیسے ہوا چلتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے ثباتی دنیا کے تحت ہر شے سفر میں ہے لیکن یہ سفر بہت ہلکا پھکا اور لطیف پہلو لیے ہوئے ہے۔ ایسا لطیف پہلو جس طرح رنگ اڑتا یا خوشبو اڑتی ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اڑتی بھی کیا ہیں ہوا میں شامل ہو جاتی ہیں۔ بظاہر رنگ اور خوشبو اپنی ہستی کو ہوا میں گم کر لیتے ہیں لیکن ہوا میں گم ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہوا کا حصہ بن جاتے ہیں بلکہ یہ دونوں ہی یعنی رنگ بھی اور خوشبو بھی خود ہوا ہو جاتے ہیں۔ ہوا ہو جانے کے محاورے سے جس خوبی کے ساتھ میر صاحب نے یہاں معنی آفرینی کا فائدہ اٹھایا ہے اس کا بھی کوئی جواب نہیں۔ رنگ ظاہر کی نمائندگی کرتا ہے اور خوشبو باطن کی......لیکن جب ان کی بے ثباتی کا سفر شروع ہو جاتا ہے تو یہ دونوں ایک جان دو قالب سے بھی آگے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یعنی بس دونوں ایک ہو جاتے ہیں اور اس دنیا کی بے ثباتی سے پہلا سبق جو حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں ہر شے کے ظاہر اور باطن میں کوئی دوئی نہیں یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔

لیکن اتنی سی بات کہہ کر اس شعر میں میر صاحب اپنے کلام کو مکمل نہیں کر لیتے بلکہ ہمیں بتا رہے ہیں کہ دنیا کی بے ثباتی پر غور کرو یہاں کی بے ثباتی فنا کی تعلیم نہیں دیتی بلکہ آگے بڑھنے کی تعلیم دے رہی ہے اور آدمی عموماً آگے بڑھنے سے خوف کھاتا ہے اور آگے بڑھنے کے عمل کو اپنی ہلاکت سمجھتا ہے۔ لیکن ذرا غور کرے تو اسے معلوم ہو جائے جس طرح آئے دن پھول کھلتے ہیں اور پھر ایک خاص وقت کے بعد ان کا رنگ اور بو ہمارے حواس کی گرفت سے باہر نکل جاتے ہیں مگر یہ تمام عمل بہت ساری لطافتوں کا حامل ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس آگے کی طرف قدم بڑھانے کے عمل کے لیے خود کو ہر وقت تیار رکھیں۔ اور خود کو تیار رکھنا یہی ہے کہ ہمارا ظاہر پھول کے رنگ کی طرح ہو کہ جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملے اور ہمارا باطن پھول کی خوشبو کی طرح ہو کہ لوگ ہماری صحبت سے ہمیشہ مہکتے رہیں۔ یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کی ہر شے پھول کی طرح کہاں ہوتی ہے؟ یہ اعتراض اپنی جگہ لیکن شعر زیر بحث میں جو

میر صاحب ''تو'' کی ضمیر استعمال فرمارہے ہیں اور اس سے انسان مراد لے رہے ہیں تو اس سے میر صاحب یہ بھی واضح کر رہے ہیں کہ تمام اشیاء میں انسان کی ہستی واحد وہ شے ہے جو اپنی ذات میں ہر طرح کی لطافت پیدا کرسکتی ہے۔ اگر وہ یعنی آدمی واقعی چاہے تو اپنے سفر حیات کو پھول کی طرح رنگ و بو سے آراستہ و پیراستہ کرسکتا ہے اور اپنی ذات میں ظاہر و باطن کی تمام رعنائیاں جذب کرسکتا ہے۔ اور اس شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع میں جو میر صاحب صلاح دے رہے ہیں کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے تو اس سے ان کی مراد یہی ہے کہ بھائی موت کے سفر سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں بس اس پر معمولی سے توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ معمولی سی توجہ انسان کو بے پناہ لطافتوں سے لبریز کرسکتی ہے۔ اور جب آدمی کی ذات لطافتوں سے بھر جاتی ہے پھر اس کے ارتقائی سفر کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ وہ آگے ہی آگے کو بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور لطافتوں سے معمور یہ سفر اس بے ثبات دنیا میں ہر وقت جاری وساری ہے۔ پھول کب نہیں کھلتے کب نہیں مہکتے اور کب وہ اپنی مہک اپنے رنگ دکھا کر آگے نہیں بڑھ جاتے۔ ہمیں بھی اسی طرح آگے بڑھ جانا ہے ہلاک نہیں ہونا۔ گویا موت ایک پرلطف سفر ہے۔

عاشقی کرنے کا ڈھنگ

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

اس شعر سے جس طرح عشق کی دیوانگی کا اظہار ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ عشق کے نظم وضبط کا بھی پتا چل رہا ہے۔ میر صاحب عاشقی کے اور عشق کرنے کے صد فی صد قائل ہیں لیکن عشق کے تجربے کو وہ خالصۂ ہوش وحواس کا تجربہ تصور کرتے ہیں۔ عشق کو یا عاشق کو آپ ہزار دیوانہ کہتے رہیں لیکن یہ دیوانہ بکار خویش ہمیشہ ہشیار رہتا ہے یا اسے ہمیشہ ہشیار رہنا چاہئے کیونکہ میر صاحب اپنے معشوق کو ایسی مخلوق ہرگز ہرگز ماننے کے لیے تیار نہیں جو ان کی گرفت سے باہر ہو۔ معشوق کے ناز و ادا اور عشوے غمزے اپنی جگہ لیکن معشوق کو ہونا ایسا چاہئے جس تک پہنچنے کے امکانات ہر وقت ہمارے سامنے ہوں۔

چنانچہ شعر زیر بحث میں میر صاحب اپنے آپ کو ایک دوسرا شخص تصور کر کے

اپنے آپ ہی پر طنز کر رہے ہیں کہ جناب میر صاحب آپ عشق ضرور کریں لیکن کسی انسان صورت شخص سے عشق کریں پری کی شکل والے شخص سے عشق کرنا چہ معنی دارد۔ تسلیم کہ عشق میں حماقت اور دیوانگی کا بھی ایکمقام ہے لیکن عشق کی حماقت اور دیوانگی آدمی کو خالی پھیکی ہواؤں میں کب اڑاتی ہے وہ تو یعنی عشق کی دیوانگی تو آدمی کو عین حقائق کے نرغے میں لاکھڑی کرتی ہے۔ اور پھر بات صرف یہاں آ کر ہی رک نہیں جاتی بلکہ عاشقی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اب معشوق کو اپنی آغوش میں لے کر یہاں سے نکلنا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ عشق کریں میر صاحب اور دوسرا کوئی ان کے معشوق کو لے اڑے۔ لہٰذا شعر زیر بحث میں میر صاحب اپنے آپ کو سمجھا رہے ہیں کہ میر صاحب کسی پری یا پری زاد سے عشق کرنا عقلمندی تو خیر کیا کہی جاسکتی ہے اس کو تو ہم دیوانگی اور حماقت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کہ عاشقانہ قسم کی دیوانگی اور حماقت میں بھی ایک خرد افروز جذباتی پہلو ہوتا ہے جو آدمی کو اس کے معشوق سے کسی وقت بھی جدا نہں ہونے دیتا۔ بس یہ دیوانگی موقع کی تلاش میں ہوتی ہے جہاں موقع ملا اور معشوق سے وصل کی گھڑی بھاگ کر آئی۔ مگر کسی پری یا پری رو سے عشق کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شعر زیر بحث میں پری رو سے عشق کرنے کا ایک باب امکان بھی کھلتا نظر آتا ہے کیونکہ اب آپ کچھ بھی کہتے رہیں میر صاحب نے پیری رو سے عشق کا آغاز کردیا ہے۔ گویا میر صاحب پری رو سے عشق کر کے عاشقی کا ایک نیا باب کھول رہے ہیں کہ آخر ہم اپنے اردگرد کے لوگوں سے ہی کب تک پیار کرتے رہیں ذرا اس ماحول سے آگے بڑھ کر بھی تو عشق کر کے دیکھنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے اس طرح آگے بڑھ کر عشق کرنے سے ہمارے اردگرد کے معشوقوں سے عشق کرنے کے تجربے میں قدرت وندرت کی ہمیں ایک انوکھی دنیا نظر آئے۔ یا اس طرح عشق کرنے سے یعنی پری روافراد سے عشق کرنے سے انسان رواشخاص کے حسن و جمال کے ہم پر جدید سے جدید ترین انکشافات واقعات کے صورت میں وارد ہونا شروع ہوجائیں۔

طنز کرتے وقت آدمی ہزار اپنی کوتاہ بینی اور تنگ دلی کا مظاہرہ کرے بعض

طنز کرتے وقت آدمی ہزار اپنی کوتاہ بینی اور تنگ دلی کا مظاہرہ کرے بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے طنز کے ذریعے بہت سے حجابات معنی بھی اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ شعر زیر بحث میں اگرچہ طنز کا موڈ بہت ہلکا پھلکا اور خوشگوار سا محسوس ہوتا ہے اور طنز کرنے والے کی طبیعت کا کچھ لاابالی پن بھی ظاہر ہو رہا ہے مگر اس طنز میں جو ایک خیر طلبی کا پہلو موجود ہے ہمیں اسے بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ یہ طنز کرنے والا میر صاحب کا خیر خواہ ہے اگرچہ اس وقت اس کے طنز کی خیر خواہی میں ایک چٹکی لینے کے احساس سے ہم انکار نہیں کر سکتے مگر یہ چٹکی بھی محبت سے بھری ہوئی ہے۔ ذرا غور کرنے پر تو یوں بھی معلوم ہوتا ہے جیسے خود پری رو میر صاحب سے کہہ رہا ہے یا کہلوا رہا ہے۔ اور اگر پری رو کی اس میں ذرا سی بھی شمولیت ہے تو پھر میر صاحب کے وارے نیارے ہیں۔ گویا پری رو میر صاحب کو اکسا رہا ہے کہ میر صاحب اب جو آپ نے ہم سے عشق فرمانا شروع کر ہی دیا ہے تو بس ڈٹ جایئے۔

عوام اور خواص کی پسند

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

اس شعر میں میر صاحب جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ شاعری کیا تمام فنون لطیفہ کا صحیح معنی میں تعلق عوام سے ہے۔ عوام نہ ہوتے تو کوئی سا بھی لطیف فن اپنی بلندیوں تک نہ پہنچ سکتا۔ گویا زندگی کی لطافتیں اور نزاکتیں جس قدر عوام کی سادہ زندگی میں رچی بسی اور گھلی ملی ہوتی ہیں اس کا عشر عشیر بھی خواص کی قسمت میں نہیں رہتا۔ آپ نے غور فرمایا میں نے یہ عرض کیا ہے کہ خواص کی قسمت میں نہیں رہتا یعنی یوں لطافتیں اور نزاکتیں تو ہر انسان کی زندگی کا حصہ ہوتی ہیں لیکن خاص لوگ اپنی تصنع بھری زندگی کے باعث ان نزاکتوں اور لطافتوں میں سے بڑا حصہ گنوا بیٹھتے ہیں۔ اور پھر یہ لوگ یعنی خواص جو حصہ گنوا بیٹھتے ہیں اس کا شعور اور احساس کسی فن لطیف کے وسیلے سے حاصل کرتے ہیں۔ جس طرح میر صاحب کہہ رہے ہیں کہ بات میں عوام کی کر رہا ہوتا ہوں لیکن اس بات کو سراہتے ہیں خواص۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ میر صاحب

کے اشعار کے ذریعے انسانی زندگی کے جو لطیف پہلو بیان ہوتے ہیں انہیں عوام تو اس لیے نہیں سراہتے یا ان پر توجہ نہیں دیتے کہ یہ لطیف پہلو یا یہ لطافتیں تو ان کی زندگی کا معمول بن چکی ہوتی ہیں لیکن چونکہ خواص انہیں گنوا چکے ہوتے ہیں اس لیے انہیں ان کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی اس کمی کو اس طرح پورا کرتے ہیں۔

میر صاحب زیر بحث شعر میں ایک طرح اپنے اسلوب ابلاغ کی شکایت کر رہے ہیں کہ میں جن کے لیے شعر کہتا ہوں وہ میرے اشعار سے متاثر نہیں ہوتے اور جن کے لیے میں ایسا نہیں کرتا وہ میرے اشعار کی تعریف کرتے ہیں۔ گویا ایک عجیب انداز سے اپنے فن شعر گوئی کی تعریف بھی کر رہے ہیں اور پھر عوام سے شکایت بھی کر رہے ہیں کہ جن کے لیے وہ یعنی میر صاحب رات دن اپنا سر کھپاتے ہیں انہیں اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہے۔ عوام اگر توجہ دیں تو میر صاحب کی شاعری کو زیادہ شہرت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس خواہش اس نکتے کو میر صاحب نے جس خوبصورت انداز میں چھپایا ہے اس کی داد بھی ضروری ہے۔ سیدھی سی بات ہے لوگوں کی جتنی زیادہ تعداد میر صاحب کے کلام کو سراہے گی اُسی نسبت سے میر صاحب کو شہرت زیادہ حاصل ہوگی۔ خواص گنتی کے ہوتے ہیں اور عوام بے شمار۔ لیکن دوسرا مصرع اپنے ابلاغ کی وسعت کے لحاظ سے بڑے معانی کا حامل ہے۔ گفتگو پر مجھے عوام سے ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ میں گفتگو عوام سے کر رہا ہوں۔ یہ بھی مطلب ہے کہ میں گفتگو عوام کے بارے میں کر رہا ہوں۔ یہ مطلب بھی ہے کہ میں جس سے اور جن کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں۔ وہ میری طرف توجہ ہی نہیں کر رہے ہیں کہیں ایسا تو نہیں میری گفتگو کا انداز عوام کی سطح سے بلند ہے لیکن یہ تو بڑی عام سی بات ہے میر صاحب کو تو یہ خطرہ لاحق ہے کہ کہیں ان کا انداز بیان عوام کی سطح سے نیچا تو نہیں ہو گیا۔ یہ نکتہ بہت توجہ طلب ہے۔ اور میر صاحب کے اس دوسرے مصرع کے لفظ ''پر'' سے اس پورے شعر ہی کے تیور بدلے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ کبھی یوں لگتا ہے میر صاحب اس لیے پریشان ہیں کہ جن کے لیے یہ شعر کہا ہے ان تک بات نہیں پہنچ رہی ہے کبھی اس لیے پریشان نظر

آرہے ہیں کہ زندگی کی جن باتوں کو میر صاحب بہت اہمیت دے رہے ہیں وہ عوام کے لیے اتنی اہم اس لیے نہیں ہیں کہ یہ باتین عوام کی زندگی میں عام ہیں۔ اور اسی لیے میر صاحب اس بات پر خوش ہونے کے بجائے ناراض زیادہ نظر آرہے ہیں کہ ان کے اشعار کو خواص پسند کر رہے ہیں۔ خواص اگر پسند کر رہے ہیں۔ تو یہ کوئی خوشی کی بات نہیں ہے وہی بات کہ خواص تعداد میں ہوتے ہی کتنے ہیں۔ بات تو عوام کے پسند کی ہونی چاہئے۔ میر صاحب کے شعر زیر بحث نے عوام اور خواص کو جس طرح تقسیم کیا ہے اس تقسیم میں معنی کا ایک جہان آباد ہے۔

میر صاحب کا سارا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو عوام تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہ اس ضمن میں مسلسل کوشش بھی کر رہے ہیں۔ لیکن میر صاحب کی بات سے جو لوگ متاثر ہو رہے ہیں وہ چند خواص ہیں۔ خواص کا میر صاحب کے اشعار کو پسند کرنا بنیادی طور پر میر صاحب کو برا تو نہیں لگ رہا ہے اور نہ برا لگنا چاہئے لیکن میر صاحب کو یہ اندیشہ بری طرح سے کھائے جا رہا ہے کہ اس قدر قادر الکلام شاعر بن جانے کے باوصف وہ اپنی بات عوام تک کیوں نہیں پہنچا پا رہے ہیں۔ واضح ہو کہ میر صاحب کا یہ اندیشہ عرف عام والا اندیشہ نہیں کہ عوام ان کی بات اس لیے نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ان کا کلام عوام کی ذہنی سطح سے بلند ہے۔ انہیں تو ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا کلام عوام کی سطح دانست سے نیچے رہجاتا ہے۔ کیونکہ جب میر صاحب اپنے کلام میں وہ خوبیاں اور خرابیاں بیان کر رہے ہیں جو عوام میں عام ہیں تو پھر یہ کیوں ہو رہا ہے کہ عوام میر صاحب کا کلام سمجھنے سے قاصر ہیں اور میر کا کلام ان پر اثر انداز نہیں ہو رہا ہے۔ غرض جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یہ بہت دلچسپ نکتہ ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

کلیاں آنکھیں اور ارتقا

میر صاحب کا ایک بہت ہی مشہور شعر ہے۔

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

بظاہر تو اس شعر کا مطلب یہ نظر آرہا ہے کہ میر صاحب اپنے محبوب کی آنکھوں کی تعریف کر رہے ہیں کہ وہ ہر وقت اس طرح لگتی ہیں جیسے ابھی ابھی سو کر اٹھی ہیں یعنی نیم خوابی کے عالم میں ہیں۔ اور آنکھوں کی اسی نیم خوابی کا جمالیاتی پہلو یہ ہے کہ وہ اس نیم خوابی کے عالم میں عجیب انداز سے دلکش اور دل ربا لگ رہی ہیں کہ جن کی دلکشی اور دلربائی کی ہم تعریف نہیں کر سکتے بس محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن ذرا غور کرنے پر پتا چلتا ہے کہ میر صاحب نے اس شعر میں محبوب کی آنکھوں کی کارفرمائی کا جو ایک اثر دکھایا ہے یعنی کلی نے جوان سے آہستہ آہستہ کھلنا سیکھا ہے اس کے تحت یوں کائنات کے حسن و جمال کے عمل ارتقا پر روشنی پڑ رہی ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ کائنات کا ہر حسن اس کے محبوب کی آنکھوں کی نیم خوابی سے اپنے آپ کو بنانا اور سنوارنا سکھا رہا ہے۔ محبوب کی کوئی ایک ادا آگے قدم بڑھاتی

ہے تو اس کے پیچھے پیچھے کائنات کی ہر حسین شے بڑی نزاکت سے پیروی کرتی چل آرہی ہے۔ کائنات کا ارتقا تو ہو رہا ہے لیکن بجلی کے کوندنے کی طرح نہیں بلکہ بہت ہی نازک اور دل جو قرینے کے ساتھ۔ بس اس طرح جس طرح کلی کھلتی ہے۔

مزید آگے قدم بڑھایئے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ علم و حکمت کے راز بھی جو فاش ہو رہے ہیں وہ بھی کچھ اس طرح فاش ہو رہے ہیں جس طرح ایک غنچہ چٹکتا ہے یا کلی کھلتی ہے۔ گویا کائنات کا ارتقا حسن و جمال سے معمور ہے۔ اور اس حسن و جمال کا سرچشمہ علم و دانش اور اس کی وہ نزاکتیں ہیں جن سے انسان کا ذہن لبریز ہے۔ شعر زیر بحث کے حوالے سے ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ محبوب کی آنکھوں کی نیم خوابی کے اثر میں پوری کائنات آئی ہوئی ہے اور وہ محبوب کی آنکھوں کی طرح دلکش و دلربا ہے اور وہ بھی یہی ہماری کائنات ایک دوسری کائنات کو حسن و جمال سے آراستہ ہونا سکھا رہی ہے۔ اور نہ صرف سکھا رہی ہے اس کی تخلیق کا باعث بھی بن رہی ہے۔

کرنے ہیں مجھے کام بہت

آپ نے میر صاحب کا یہ شعر تو بہت سنا ہوگا۔

دل خراشی و جگر چاکی و خوں آشامی
ہوں تو ناکام پہ کرنے ہیں مجھے کام بہت

اس شعر سے ہمیں میر صاحب کی مصروفیت ہی کا پتا نہیں چلتا ان کی بلانوشی کا راز بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ناکامی مسلسل آگے بڑھنے کی ایک بہت عمدہ تعبیر ہے۔ خواب تو جیسے اس تعبیر کے آگے پیچھے پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور خوبصورت سے خوبصورت خواب دراصل ہماری ناکامی کا مرہون منت ہے۔ ناکامی میں یا ناکام ہوتے ہوئے بھی آدمی خواب دیکھنے سے باز نہ آئے بس اس حقیقت حیات افروز کو کوئی میر صاحب سے پوچھے۔ بقول میر صاحب آدمی ناکام ہو ہی نہیں سکتا اور اگر وہ ناکام ہو رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تصور کامرانی کوئی بہت ہی بلند قسم کا ہے۔ ناکامی میں ہمت ہار بیٹھ نہیں جانا چاہئے بلکہ یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ آخر ہم ناکام ہوئے تو کیسے؟

بس زیر بحث شعر میں میر صاحب اسی سوال کا جواب دے رہے ہیں۔ اس

ان کے ہوتے ہوئے آدمی ناکام کیونکر ہوسکتا ہے۔ ضرور ہم نے اس طاقت کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ لہٰذا دل کو چھیل کر جذبات کی سطحوں کو کھرچ کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہماری یہ طاقت کمزور کیسے پڑ گئی۔ جذبات کی ٹوہ لگائی جائے گی تو اس سے اپنی طاقت کے غلط استعمال کا پتا چلے گا۔ یا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جذبات سے ہم نے کوئی کام ہی نہ لیا۔ محض ہماری خود کلامی نے ان کی ساری ہوا نکال ڈالی ہو۔ بہر حال ناکام ہونے پر میر صاحب پہلا کام اپنے جذبات کی چھان پھٹک سے شروع کرتے ہیں۔ اس ضمن میں دوسرا کام جگر چاکی ہے یعنی یہ پتا لگانا ہے کہ ہمارے حوصلے ہماری ہمت کیوں اور کس جگہ پست ہوئی بلکہ آخر ہمارے حوصلوں اور ہمت کو کیا ہوگیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوگیا کہ جذبات کی طرف سے ہماری غفلت نے ہمارے حوصلوں کو بھی پست کر دیا۔ باقی رہی خوں آشامی کی بات تو اس سے میر صاحب کی مراد یہ ہے کہ خوں آشامی تو اپنی زندگی پر اچھی طرح غور کرنا ہے۔

عمل کی چھُوٹ

جی میں آوے سو کیجیو پیارے
ایک ہونا نہ درپئے آزار

میر صاحب کے اس سیدھے سادے سے شعر میں جو آدمی کے حُسنِ عمل اور ذوق عمل کی چکا چوند سے نظر آ رہی ہے اس پر ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی آدمی جو چاہے کرے بس ایک کام نہ کرے اور وہ یہ ہے کہ کسی کو تکلیف پہنچانے کے درپے نہ ہو۔ بظاہر تو یہ پابندی نظر آتی ہے لیکن ذرا توجہ سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی پابندی نہیں ہے۔ ایک طرح کی یہ بھی آزادی ہی ہے۔ کہ فطرتاً آدمی کسی کے درپئے آزار ہونا بھی نہیں چاہتا۔ آزادئ عمل کا سارا راز آدمی کی خوشیوں میں ہے اور آدمی کی خوشیوں کا راز یہی ہے کہ وہ کسی کو اپنی طرف سے تکلیف نہ پہنچائے۔ وہی بات کہ آدمی کی نفسیات میں کسی کو تنگ کرنا یا پریشان کرنا ہے ہی نہیں۔ آدمی کسی کو تنگ اپنی خوشی کے لیے نہیں کرتا۔ کسی مجبوری کے تحت کرتا ہے......اور یہ مجبوری بھی کسی فطری تقاضے کے تحت نہیں ہوتی یہ تو سارے کا سارا تکلّف اور تصنع ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی جب کسی کے درپے آزار ہوتا ہے تو اپنی خوشی سے یا اپنے اختیار کو عمل میں لاتے ہوئے ایسا نہیں کرتا۔

شعر زیر بحث کے معنوی حسن کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی کچھ کر گزرنے کے ضمن میں بھی اپنے آپ پر کوئی پابندی عائد نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے جب اسے کوئی یہ کہتا ہے کہ بھائی میاں تمہارا جو جی چاہتا ہے وہ کرو تو اس چھوٹ

یا اس آزادی پر خواہ یہ آزادی محض زبانی کلامی ہی کیوں نہ ہو اس کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں۔ گویا آزادیٔ عمل کی فضا پیدا کرنے کے ضمن میں پہلا قدم تو یہی ہے کہ آدمی کو واضح طور پر بتایا جائے کہ کچھ کر گزرنے کے ضمن میں تم پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے ..... اصل میں یہ اعلانِ آزادی ہر اعتبار سے دل خوش کن اس لیے ہوتا ہے کہ اس میں آدمی کو اپنی وسعتِ اختیار کی اطلاع ملتی ہے ادھر کچھ کر گزرنے کے لیے آدمی ہر وقت تیار ہوتا ہے اسے تو صرف ایک معمولی سے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ اس سہارے کو ایک معمولی سا اشارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ترغیب عمل کے لیے یہ معمولی سا اشارہ بھی آدمی کے لیے بہت بڑی طاقت اور توانائی کے مترادف ہوتا ہے۔ سماجیات اور عمرانیات کے حوالے سے آدمی کو ابھی تک یہی سمجھایا جاتا رہا ہے یا ہم اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تشکیل معاشرہ کے ضمن میں آدمی کے لیے پہلی شرط یہی لگائی جاتی رہی ہے کہ دیکھو تم ایک سماجی جانور ہو مل جل کر رہے بغیر تم اپنی آدمیت برقرار نہیں رکھ سکتے لہٰذا اگر تم اپنی سماجی حیثیت کو قائم رکھنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنے آپ پر کچھ پابندیاں عائد کرنا ہوں گی۔ لیکن آپ جانتے ہیں پابندی لگانے کا یہ ایک منفی انداز ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

اس کے برعکس مثبت انداز یہ ہے جیسا کہ میر صاحب نے اپنے زیر بحث شعر میں اختیار کیا ہے کہ پہلے آدمی کو عمل کی پوری پوری آزادی دے ڈالی یہ کہ کر ''جی میں آوے سو کیجیو پیارے'' اور پھر بعد میں دوسرے مصرع میں یہ کہدیا ''ایک ہونا نہ درپئے آزار''...... اس دوسرے مصرع کی لفظی ساخت پر غور کرنے سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مصرع میں کرنا'' کے بجائے'' ہونا'' کا فعل استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہنا کہ میاں کسی کو تکلیف دینے کے درپے نہ ہونا ایک طرح سے آدمی کو اختیار دینے کے برابر ہے کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ ایک یہ کہنا کہ ایسا نہ کرنا اور ایک یہ کہنا ایسا نہ ہونے دینا سوچیں تو اختیاری فعل ہی بن جاتا ہے اور اختیاری فعل میں آزادی برقرار رہتی ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا پہلے مصرع کی

آزادی نے دوسرے مصرع کی پابندی کو ایک اختیاری فعل میں تبدیل کر دیا۔ آدمی سوچتا ہے جب مجھے یہ کہدیا گیا ہے کہ میاں جو جی میں آئے وہ کرو تو پھر کسی کو تکلیف نہ پہچانے کی شرط، پابندی کہاں رہ جاتی ہے ایک طرح سے وہ بھی آزادی ہی تو ہوئی دوسرے لفظوں میں جیو اور جینے دو والی بات کہہ لیجئے تو جس طرح جیو ایک آزادیٔ عمل کا مشورہ ہے اس طرح جینے دو کہہ کر اسے اختیار کو عمل میں لانے کی درخواست ہی سے تعبیر کرنا چاہئے۔

میں دوبارہ شعر زیر بحث کی اس خوبصورت نفسیاتی حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہوں گا کہ آدمی کو آپ جس قدر اس کی آزادی عمل کا احساس دلائیں گے اُسی قدر وہ اپنے اختیار کو سوچ سمجھ کر استعمال میں لائے گا اور جس قدر آپ اس کی آزادی عمل کو محدود کریں گے اسی قدر اس کے یعنی آدمی کا آزادیٔ عمل کے اعتبار سے گمراہ ہونے کا اندیشہ لاحق ہوگا۔ آدمی کی نفسیات کا ایک تقاضا اور بھی ہے اور یہ تقاضا بھی اپنی نوعیت کے پیش نظر بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ آدمی کی یہ بہت بڑی خواہش اور تمنا ہوتی ہے کہ لوگ یعنی اس کے ابنائے جنس اس پر بھروسہ کریں۔ وہی بات کہ آپ جس قدر آدمی کی ذات پر بھروسہ کریں گے اسی نسبت سے وہ اپنی جگہ مضبوط اور قائم دائم ہونے کی سعی کرے گا۔

میر صاحب نے شعر زیر بحث میں آدمی کی اسی خواہش اعتماد کا اظہار کیا ہے اور اسی خواہش اعتماد پر اعتماد کرتے ہوئے یہ شعر کہا ہے۔

جی میں آوے سو کیجیو پیارے
ایک ہونا نہ درپۓ آزار

آدمی کے عمل پر کوئی پابندی نہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ اگر آدمی کے عمل پر پابندی نہ لگائی جائے تو پھر آدمی خود اپنے عمل پر پابندی عائد کرتا ہے۔ اس خوبصورت راز کو تا حال کسی انسانی معاشرہ کے مقتدر افراد سمجھ نہیں پائے اور وہ خواہ مخواہ اپنی طرف سے پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ اور بہت بھونڈے انداز میں عائد

کرتے ہیں۔ اگر پابندیاں عائد کرنے کا انداز احتیاط کے ساتھ ہو پھر بھی کوئی ہرج نہیں مگر یہاں بھی مقتدر افراد عدم توجہی سے کام لیتے ہیں۔ اور آدمی کے اختیار کی برکات سے پورے معاشرے کو محروم کردیتے ہیں...... واضح رہے کہ آدمی اپنے طرف سے شر فساد نہیں کرنا چاہتا یہ پہل بھی مقتدر لوگوں کی طرف ہی سے ہوتی ہے۔ بہر حال انسانی نفسیات اور جبر واختیار کے ضمن میں شعر زیر بحث بہت معنوی اہمیّت کا حامل ہے۔ اور توجہ خاص کا متقاضی ہے۔

نامور پاکستانیوں کا بچپن

برصغیر کے منفرد حکمران

پاکستان کے منفرد صوفی شاعر

10 نامور شخصیات
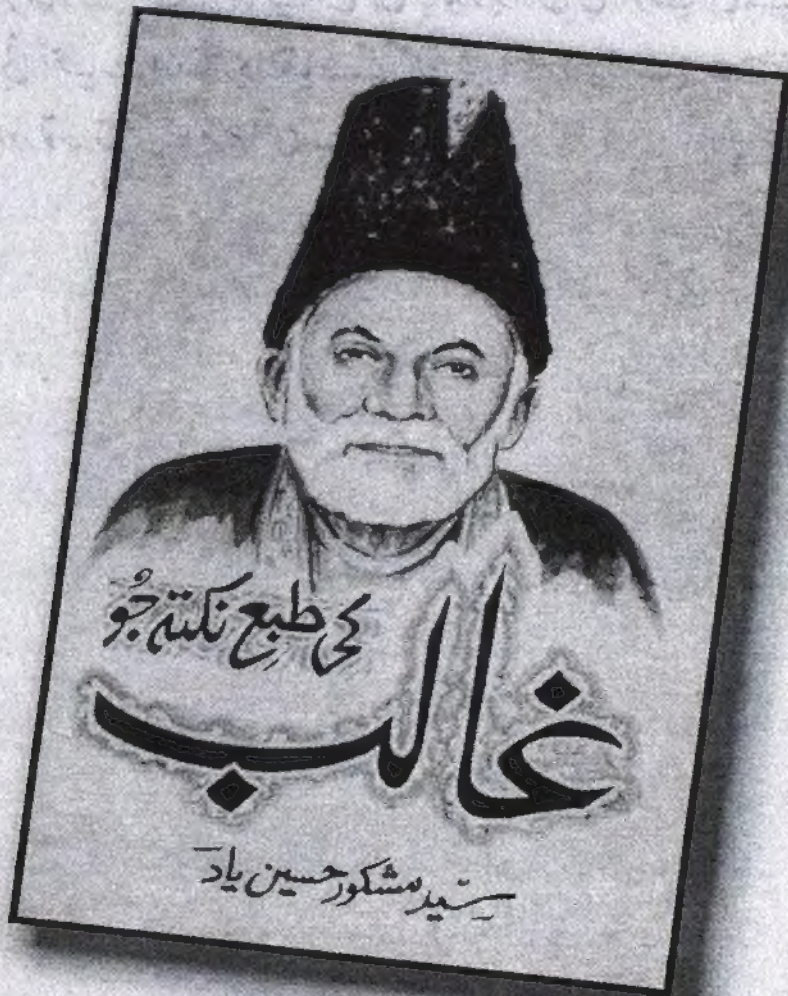
رنگارنگ، خوبصورت اور کارآمد کتابیں
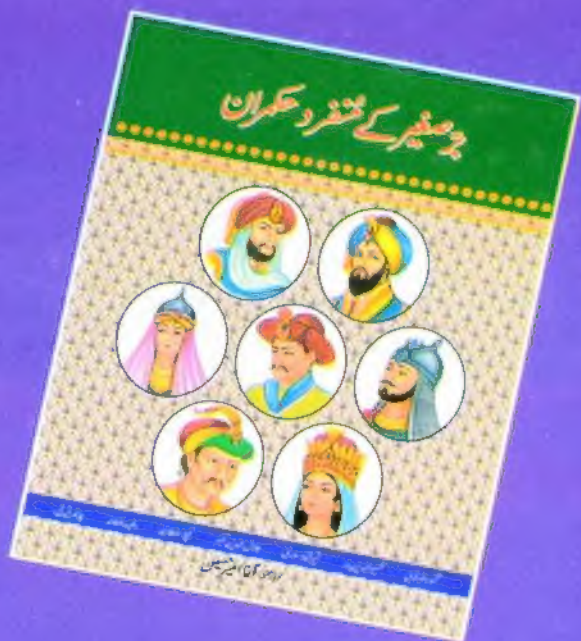
فی کتاب 75 روپے

Classic 42-The Mall, Lahore.